چراغِ طاقِ جہاں
مجید امجد

چراغِ

طاقِ

جہاں

اب دردِ کشش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اب تو نیند کو آجانا چاہیئے
امجد ان اشک بار زمانوں کے واسطے -
اک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیئے

مجید امجد

شاعر

چراغِ طاقِ جہاں

تاج سعید

مرتب

سنگ میل پبلی کیشنز ـــــ لاہور

کوائف نامہ

پہلی بار	ـــــــــ	۱۹۸۰ء
تعداد	ـــــــــ	گیارہ سو
ناشر	ـــــــــ	نیاز احمد سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
طابع	ـــــــــ	منظور پرنٹنگ پریس لاہور
خطاطی	ـــــــــ	خادم حسین کشش، پشاور
سرورق	ـــــــــ	حمید ساغر
قیمت	ـــــــــ	۱۸ روپے

خلیل حشمی کے نام

جس نے مجید امجد کی موت کا دوسرے شاعروں اور اس
کے عزیز ترین دوستوں سے بھی نہیں زیادہ ماتم کیا،
اور وہ نہ صرف اس شاعر کی تنہائی پہ پہروں رویا،
بلکہ اس نے اس کے فراق میں درجنوں نوحے لکھے۔
ان نوحوں میں مجید امجد کا ڈکشن اور اس کی
مخصوص تراکیب اس طرح سے جلوہ گر ہیں کہ انہیں
پڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم سے مجید امجد
خود ہمکلام ہے۔

تاج سعید

سلام ان پہ تہ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا، جو تو چاہے

مجید امجد

ترتیب

میرے خدا میرے دل / شبِ رفتہ کے بعد

غزلیں

ان گنت سورج

فنونِ مجید امجد نمبر

انجمن انجمن رہا تنہا

"قہقہے بکھرتے رہتے ہیں
آنسو مٹی میں جذب ہوتے رہتے ہیں
کھلیانوں کا سہاگ آنسو، پھولوں کی آبرو آنسو
سہاگ رات کا آئینہ —— چودھویں کا چاند —— اور
چاندنی اجنبی اجنبی آشنا آشنا لمحوں کا سفر
علم اور عمل کے مسافر، ساتھ ساتھ تنہا تنہا
چپ چاپ چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے
کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر بن جاتے ہیں
انسان، فن کار اور مسافر، وقت کے جسم سے مستقبل کے پھول نوچتے نوچتے
راکھ ہو جاتے ہیں اور ہوا کی سرگوشیاں کہتی ہیں
"ہماری تنہائی پر کون روئے گا"

—— احمد ظفر

زیدامجد بھی تنہائی کا خوگر تھا۔ اس نے ہنگاموں سے دور رہ کر اپنا وقت گزارا۔ زندگی کے لطف و کرم سے اپنے آپ کو اس نے محروم ہی رکھا، اور عمر بھر ایک نپی تلی چال سے گھر سے دفتر تک کا فاصلہ چپکے چپکے طے کیا اور اگر کبھی بہت جی چاہا تو ایک دوست کے ہوٹل میں جا کر چند لمحے گزار آیا۔ وہاں اگر کوئی شاعر دوست مل گیا تو اس سے ادب و شعر کے بارے میں گفتگو کر لی، ورنہ دل کی باتیں شاید وہ اس ہوٹل کے مالک سے

بھی نہیں کہتا تھا، جو اُس کا دوست تھا اور جسے آخر دم تک یہ فخر رہا کہ مجید امجد نے اپنے چند قیمتی لمحے اس کے ہوٹل میں گزارے تھے۔

گھر گرہستی کے جھنجھٹ سے بھی وہ ایک طرح سے لاتعلق تھا اس سارے محور کا نگراں اس کا ذاتی ملازم محمد علی تھا، جس نے گرمی، سردی اور خزاں بہار کے سارے روپ اس کے ساتھ دیکھے، لیکن اس کا ذہن مجید امجد کے ذہنی سفر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکا ورنہ وہ ہمیں ان لمحات کے بارے میں کچھ بتاتا کہ امجد نے زندگی کو اس قدر خاموشی سے کیوں بسر کیا؟ اس کے عوامل کیا تھے؟

دل نے ایک ایک دُکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا

جو میرے گنجِ دل میں گونجتے ہیں
نہیں دیکھے وہ دنیا نے زمانے

دنیا ساری ہمہموں اور پُرشور گہما گہمی میں مصروف رہی اور مجید امجد کے گنجِ دل میں کسی نے کبھی جھانک کر نہ دیکھا کہ اسے کیا دُکھ ہے؟ اس کی تنہائی کا سبب کیا ہے؟ وہ تنہائی کا خاموش سفیر بن کر اپنے دل کی باتیں شعروں میں بیان کرتا رہا۔ اس کی کوتا کا ہر روپ بڑا دھیما اور مدھم سروں کا حامل ہے۔ اس کی سوچ و فکر کی پرتیں اتنی باریک اور شفاف ہیں کہ ان پر باریک تار بھی نہیں جھلملاتا ــــ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی شعری تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی ابھی تک اس درد و کرب کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ اس کی زندگی کے کئی رُخ، جن سے اُن کے احباب آشنا ہیں، وہ بیان نہیں ہو پاتے۔

"مجید امجد کی شاعری حقیقتوں سے قریب ہے اور اس کے چھوٹے موٹے دُکھ سکھ اس کی نرم و نازک اور بظاہر سطحی اور معمولی حقیقتوں اور واقعات

کی شاعری ہے۔ اس کی نظمیں گھروندوں کی مٹی کی سوندھی
خوشبو، بس اسٹینڈ کی گرد، شہر کی گلیوں میں بارش کی
بوندوں کے بجتے ہوئے رباب اور سوکھے پتوں کی
مہک سے معمور ہیں۔ حقیقت سے آنکھ ملانے کی
یہ سکت اور اس زمین کے حسن کو پہچاننے کی یہ
کوشش ہی مجید امجد کی نظموں میں براہِ راست اظہار
کے باوجود لطافت اور شعریت برقرار رکھنے کی
ذمہ داری ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن

یہ حوالہ تو مجید امجد کی "شبِ رفتہ" کی شاعری کا ہے، لیکن مجید امجد نے شبِ رفتہ
کے بعد بھی اپنی شاعری میں دکھوں اور آہوں اور سوکھوں، نظاروں اور فطرت کے حسن
کو اسی وضع کے لہجے میں بیان کیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعے سے آدمی ایک ایسی
خوابناک فضا سے آشنائی حاصل کرتا ہے جس میں کسی قسم کی کرختگی یا بوجھل پن نہیں
ہے۔ نرم نرم پھوار اور دھندلکوں کے عکس جو بینائی پر خوشگوار اثر ڈالتے ہیں ـــ دراصل
مجید امجد کو چکاچوند کر دینے والی روشنی سے چڑ ہے۔
اس نے ساہیوال جیسے شاداب شہر میں زندگی بسر کی ہے۔ جہاں شہری فضا
نہ ہونے کے برابر ہے۔ پنجاب کے دیہات کا سادہ حسن اور سایہ دار درختوں سے
ڈھکے ہوئے راستے جن سے سورج کی روشنی بھی چھن چھن کر آتی ہے اور شدید گرمی
میں بھی فرحت و راحت کا احساس دلاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں
کی فضا بھی ایسی ہی دلآویز اور دلوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ اس کی شاعری کا ڈکشن
مستعار و مسروقہ نہیں ہے بلکہ خود اس کا پیدا کردہ۔

" مجید امجد کا سنِ پیدائش ۱۹۱۴ء ہے اور قریب قریب
اسی زمانے میں میراجی، فیض اور راشد نے جنم لیا

تھا۔ مگر یہ سب لوگ دھومیں مچاکر اور تماشا دکھاکر شاعری
کی سٹیج سے جا چکے ہیں اور مجید امجد کا ایکٹ جوپس
منظر کے طور پر پہلے بہت دور دکھائی دیتا تھا، اب
سٹیج کے آخری کنارے تک آگیا ہے اور قارئین
کی آنکھوں کو چکا چوند کر رہا ہے۔"

—— شہزاد احمد

اس بات سے اب کسے انکار ہوسکتا ہے کہ مجید امجد کے فن کے پرستاروں میں اب دن بدن اضافہ ہونے لگا ہے اور جدید ترین نسل بھی اس کی شاعری کی دھڑکنوں کو لپنے سینے میں محسوس کرنے لگی ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ مجید امجد نے اپنے فنِ شعر کے لئے جو طریقۂ اظہار وضع کیا تھا اس سے وہ باخبر تھا اسے معلوم تھا کہ بلند آہنگ کی شاعری اپنی گھن گرج کے سبب زیادہ دیرپا اور اثر انگیز نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ امجد نے اپنی شاعری کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جس پر اسکی سوچ وفکر ہی اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔

"مجید امجد اپنی غزل میں سوچ کی بے حرف لویں جلاتا
اور الفاظ کا تیل استعمال کرکے انہیں جلا بخشتا ہے۔
یہاں مایوسیاں، تنہائیاں اور اداسیاں بھی اس کا
گھیراؤ کرتی ہیں۔ مگر وہ ان میں ڈوب کر بھی باہر نکل
آتا ہے۔ پت جھڑ کے اداس اور بے رنگ
موسموں کی گرد بھی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں
دیتی بلکہ شگفتگی کے گلاب کھلاتا ہوا، اور اردو
غزل کو مسرت اور شادمانی کے ہفت رنگ موسموں
کا سندیسہ دیتا ہے اور یوں انسانی حوالے سے زمین و
آسمان اس کے بلند افق پر ملتے دکھائی دیتے ہیں

اور پھر وہ غزل کو ابدی لہجے عطا کر کے خود اسی مٹی میں
رچ بس جاتا ہے جس کی خوشبو اس کے سارے
بدن میں پھیلی ہوئی تھی۔"

——— طاہر تونسوی

مجید امجد تنہا اور اداس ضرور رہا، مگر اس نے ان اداسیوں کے سمندر میں ڈوب کر اپنا آپ نہیں کھویا، اس لحاظ سے وہ باہمت آدمی تھا کہ اس نے تنہائیوں اور مایوسیوں کے گھیراؤ میں بھی زندہ رہنے کی امنگ اور جرت جلائے رکھی۔ آتے جاتے موسم اس کے بے رنگ ایواں میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے۔ لیکن وہ اپنی سوچ و فکر کے چراغ سے اپنی نظم و غزل کو سنوارنے میں مگن رہا، اور یہی اس کا کمالِ فن ہے، جس کو خراج پیش کرنے کے کتنے ہی طریقے اختیار کئے جائیں، اس کا حق ادا ہو نہیں سکتا۔

"امجد کی شاعری کے سفر میں قیام نہیں ہے۔ اس
کے ہاں قیام کا تصور ہی نہیں۔ وہ تو نو بہ نو امکانات
کا شاعر ہے۔ مجھے اس کے سفر کی مثال یوں سمجھ
میں آتی ہے کہ وہ مسلسل پرواز میں رہتا ہے۔ اس
کے سامنے لامحدود کائناتیں پھیلی ہوتی ہیں، وہ انہیں
دیکھتا چلا جاتا ہے۔"

——— ذوالفقار احمد تابش

یہی سبب ہے کہ اس کی شاعری کا کینوس وسیع ہے اور اس کا آپ جتنا بھی مطالعہ کریں گے آپ پر اس کے اسرار کھلتے جائیں گے۔ آفاقی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی پرتیں آپس میں گتھی ہوئی ہوتی ہیں اور جب آپ اس کے قریب ہوتے ہیں تو ایک ایک پرت آپ پر جہانِ معنیٰ آشکار کرتی چلی جاتی ہے۔

"مجید امجد کو رفعتِ مقام بھی حاصل ہے اور
شہرتِ دوام بھی، البتہ اس رفعت کے ادراک اور

اور اس شہرت کے اعتراف میں دیر ہو رہی ہے اور وجہ صرف یہی ہے کہ وہ معمول کا شاعر نہیں تھا اس کے لہجے کے دھیمے پن میں جو کاٹ ہے اس سے ہم مانوس نہیں ہیں اور طرزِ اظہار میں جو انوکھا پن ہے، اس کے ہم عادی نہیں ہیں۔ "بالِ جبریل" کی اشاعت پر جب اقبال کی غزل کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس نے اردو غزل کی سالہا سال کی مسلمہ روایت کی بنیاد ہلا دی ہے، تو کہنے والوں نے اپنی ذہنی اور ذوقی سطح کے مطابق درست کہا تھا۔ دراصل وہ اقبال کے نئے لہجے اور اس کی شاعری کی نئی ڈکشن سے متعارف ہی نہیں تھے اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ غزل کی روایتی لفظیات سے مختلف لفظیات میں بھی غزل کہی جا سکتی ہے۔ انہوں نے غزل کو پتھر سے تراشے ہوئے بت کا درجہ دے رکھا تھا۔ جس کے جو خدوخال بن گئے سو بن گئے اور اگر انہیں بدلا گیا تو بت ٹوٹ جائے گا۔ بعد میں اردو غزل میں اقبال کے لہجے کی گونج ان شاعروں کے ہاں بھی سنائی دینے لگی جو اس لہجے پر سب سے زیادہ معترض تھے۔ مجید امجد کے ساتھ بھی کم و بیش یہی سلوک ہو رہا ہے۔ مگر اس ناروا سلوک کے عقب میں اس شاعر کی عظمت کے اعتراف کا آفتاب طلوع ہونے لگا ہے۔ اونچی شاعری آخرکار اپنے آپ

کو منوا لیتی ہے۔ المیہ صرف یہ ہے کہ عموماً ایسی شاعری
کرنے والے کی زندگی اس اعتراف کے اُجالے
سے محروم رہ جاتی ہے"۔

—— احمد ندیم قاسمی

مجید امجد کی شاعری سے مکمل طور پہ آشنائی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ اس کے اشعار کا مطالعہ ڈوب کر کیا جائے۔ اس لئے کہ الفاظ کے اس سمندر میں جب تک قاری غوطہ زن نہ ہو، وہ ان کے معنی و مفاہیم کو آسانی سے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔
ہم نے اس مجموعے میں مجید امجد کی بہت ساری تخلیقات میں سے صرف ایسی نظموں کا انتخاب کیا ہے، جن کے مطالعے سے مجید امجد کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کی شاعری کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں اور اس کی ہر سطر میں اس دھرتی کی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے، جو انسان کے دل و دماغ پہ ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری کرتی ہے۔ یہ کیفیت بالکل سبزہ و گل کی ٹھنڈک اور چاندنی کی خنکی سے ملتی جلتی ہے ——
تو آیئے ہمارے ساتھ ان کیف نظاروں بھرے جہان کی سیر کیجیے ——

تاج سعید

پشاور ۱۸ مارچ ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر سلیم اختر

پھول نرگس کا

جدید نظم میں دو رجحانات بہت نمایاں نظر آتے ہیں گر ان دونوں رجحانات کو اُجاگر کرنے کے لئے خاص اصطلاحات نہیں ملتیں۔ ایسی اصطلاحات جو ان رجحانات کا آئینہ بن سکیں تاہم افہام و تفہیم کے لئے انہیں مقصدی شاعری اور اس کے برعکس کہا جا سکتا ہے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ دیگر شعراء فکر و اظہار کے ہزار تنوع کے باوجود بنیادی طور سے مقصد پسند ہیں جبکہ میرا جی۔ ن م راشد۔ مجید امجد وغیرہ ان کے برعکس اور سب کچھ ہو سکتے ہیں گر ترقی پسندوں جیسے مقصد پسند نہیں ہو سکتے ویسے مقصد پسندی سے لاتعلقی کی بات نہ تو تعریف کے لئے کی گئی اور نہ مذمت کے لئے بلکہ ان کی سوچ اور وژن کی بنیادی خصوصیات کے اظہار کے لئے ہی نہیں بلکہ زمانے نے اس رجحان کو مزید تقویت بھی بخشی، چنانچہ گذشتہ دو دہائیوں میں شعراء کا جو گروہ اُبھرا اور جسے ان کے داخلی تضادات نثری نظم تک لے گئے وہ بھی اسی لامقصدیت سے وابستہ سمجھے جا سکتے ہیں اور اس حد تک کہ انہوں نے اپنی شاعری کو اس کی صحیح معنوں میں علامت بنا دیا۔

مقصد پسندی کے برعکس رجحان کی نمایاں ترین مثالوں میں بلاشبہ میرا جی، راشد اور مجید امجد کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں بلکہ اپنے مخصوص طرز احساس اور طرز اظہار کی بنا پر تینوں جدید نظم میں بعض منفرد میلانات کے مظہر بھی بن جاتے ہیں۔ گو یہاں ان تینوں کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں لیکن ایک بات ہے کہ ان تینوں کے ہاں فرسٹریشن اور اس سے جنم لینے والے کئی طرح کے نفسی میلانات نے ان کی وژن اور شاعری کو وہ مخصوص انفرادیت عطا کی جس نے نہ صرف انہیں منفرد بنایا بلکہ یہ جدید شاعری کے ان مخصوص رجحانات کی لول ساک

بنے کہ آنے والے کم صلاحیت شعراء کے لئے ایک طرح سے روایت کی صورت اختیار کر گئے۔

ایک اور چیز جس نے بطورِ خاص انہیں ایک خاص رنگ میں رنگا اور جو بعض امور کے لحاظ سے ان کی شخصیت کے بنیادی میلانات میں سے ہے، وہ ہے ایک خاص طرح کی مردم بےزاری، نہ جانے انسانی تعلقات میں یہ کس پیرایہ سے رونما ہوتی ہوگی لیکن فن کی سطح پر اس نے موضوعات اور اسالیب کی اس بت شکنی کی صورت میں جنم لیا جس نے انہیں زندگی بھر متنازعہ فیہ بنائے رکھا میراجی کا جنسی طرزِ عمل نارمل انسانوں کو ریجیکٹ کرنے کا ایک انداز تھا۔ راشد کبھی ہمعصر شعراء کو خاطر میں نہ لایا اور مجید امجد تمام عمر لوگوں سے جذباتی لحاظ سے منقطع رہا۔ ان تینوں کے ہاں اس رجحان نے مختلف انداز اختیار کئے انفرادی نظموں کے ساتھ ان کی شاعری کی عمومی فضا سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس کیفیت نے ان کی سائکی سے جنم لیا اور نفسیاتی لحاظ سے جس کے اظہار کے لئے وہ مجبور تھے، آنے والے شعراء کے لئے وہ بھی ایک طرح کی روایت بلکہ فیشن بن گئی، چنانچہ گذشتہ ایک چوتھائی صدی میں ابھرنے والے جدید شعراء کے ہاں "تنہائی کا دکھ" "ذات کا کرب" اور اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا جو بطورِ خاص ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے تو یہ ذاتی واردات کم ہے اور ان رجحان ساز شعراء کا ورثہ زیادہ۔

جہاں تک مجید امجد کا تعلق ہے تو اس کے ہاں تنہائی کے کرب کا یہ رجحان نمایاں تر نظر آنے کے ساتھ ساتھ اس کے ڈکشن میں خاص انداز سے رنگ آمیزی بھی کرتا ہے اس کا اظہار اس نے غزلوں میں بھی کیا اور نظموں میں بھی، غزلوں میں جب اس کیفیت کا ابلاغ ہوا تو یہ میر تقی میر تک جا پہنچا ہے۔ جیسے یہ شعر:

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا

اس طرح کے اشعار کی کمی نہیں اور ان میں بالکل دوٹوک انداز میں بات کی ہے شاید یہ بات تنقیدی اہمیت کی نہ ہو لیکن اس کی شخصیت کو سمجھنے میں کسی حد تک کارآمد ثابت ہو سکتی ہے کہ مجید امجد تمام عمر شعوری کاوش سے ادیبوں کے گروہ لاہور

سے دور رہا، نہ اس نے لاہوری ادیبوں کے جنرل بس اسٹاپ یعنی ٹی ہاؤس میں اپنا خوانچہ لگانے کی کوشش کی نہ ریڈیو ٹی وی کے پروڈیوسروں پر پروانہ بن کر نثار ہوا۔ وہ پبلک ریلیشنگ کے فن میں بھی خاصا نالائق دکھائی دیتا ہے، چنانچہ زندگی میں کبھی کسی ادارہ نے اس کے ساتھ شام منانے کی ضرورت محسوس کی۔ رسالوں کے نمبر تو نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ اس کی طبعی شرم ہو یا وہ انائی تسکین جو ہر اس فن کار کو مل سکتی ہے جو صرف اپنے فن کو اپنا انعام جانتا ہے۔ وجہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اتنا یقین ہے کہ تمام عمر وہ انجمن انجمن رہا تنہا، کی تعبیر بنا رہا لیکن کمال یہ ہے کہ مرا تو ہر انجمن میں اپنا تذکرہ چھوڑ گیا۔ اپنے ہاں کی بے وفا اور صرف صورت آشنا ادبی دنیا کا یہ معجزہ ہے کہ موت کے تیسرے دن کے بعد بھلا دینے کے برعکس اسے ہر ایک نے یاد کیا، ہر حلقہ نے اسے اپنایا (میرا اشارہ محض اربابِ ذوق کی طرف نہیں) اسے نقاد بھی مل گئے مرثیہ خواں بھی اور مجاور بھی۔ اُس کی زندگی میں صرف اظہر جاوید نے "تخلیق" کا ایک سیکشن اس کے لئے وقف کیا تھا مگر مرنے کے بعد ہر پرچے نے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ تاج سعید کی مرتبہ "میرے خدا مرے دل" اس کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں اور "شبِ رفتہ" میں کوئی پندرہ برس کا وقفہ ہے۔

"شبِ رفتہ" سے لیکر وفات تک مجید امجد فن اور وژن میں جن جہات تک جا پہنچا گو اس کتاب میں وہ سب کچھ نہیں لیکن بلحاظِ مزاج یہ دونوں مجموعے اتنے منفرد ہیں کہ "شبِ رفتہ" اور "مرے خدا مرے دل" دو علیحدہ شاعروں کی کتابیں معلوم ہوتی ہیں گذشتہ چند برسوں میں مجید امجد نے اسلوب اور تکنیک کے فن میں بعض عہد آفریں تجربات کئے ایسے تجربات، کہ ان کی بنا پر وہ ان دونوں مجموعوں سے الگ ایک تیسرے مجموعے کا شاعر نظر آتا ہے لیکن تنہائی کا احساس ہر جگہ مشترک ہے۔

میری مانند خود نگر تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا

اس شعر میں ذات کا جو کرب ہے وہ محض ذات تک محدود نہیں رہتا چنانچہ

توسیعِ شہر میں کٹے درختوں کی حیات بخش سبز خنکی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر کے یوں گویا ہوتا ہے :۔

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک ۔ اے آدم کی آل

"سوچ کی لہکتی ڈال" بہت معنی خیز ہے کہ ڈالی اور اس کی ہریالی سے وہ خود کو فطرت کے نمو پذیر پہلو سے ہم آہنگ کرتا ہے ۔ یہ ہم آہنگی وحدت الوجود والی نہیں نہ ہی اس میں فطرت کی خوش رنگی سے دل بہلانے کا جذبہ ہے ۔ زندگی کی تپتی دھوپ میں کالے کوسوں کا سفر کرنے والا ہی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کے سکھ کو جانتا ہے" مجید امجد آدمیوں سے کٹا ہوگا مگر وہ زندگی سے نہیں کٹا ، اس لئے اپنے بنجر معاشرہ میں درختوں کی ڈالیوں کے ساتھ ساتھ سوچ کی ڈالیوں پر بھی ہریالی دیکھنے کا متمنی ہے ۔ درخت کا ٹنا "توسیعِ شہر" کے لئے لازم ٹھہرا اس سے وہ یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ اس نوعیت کے دیگر توسیع پسندانہ عزائم اور مقاصد کہیں وہ دن نہ لے آئیں کہ اس قتل گاہ میں صرف اک سوچ کی لہکتی ڈال ہی باقی نہ بچے ۔

مجید امجد اپنے وجود کو نرگس کا پھول قرار دیتا ہے تو اپنی سوچ کو لہکتی ڈال ، کھلی آنکھ والی نرگس بیمار اور فطرت کی نمو پذیری کی علامت لہکتی ڈال ۔ ہو سکتا ہے منطقی طور پر ان دونوں میں تضاد محسوس ہو اگر یہ تضاد ہے تو شاعرانہ تضاد ہے مگر مجید امجد اس تضاد کو اس کی ظاہری حیثیت میں پیش کرنے کے برعکس اسے اپنی شخصیت کے میلانات کے ساتھ فنکارانہ انداز سے ہم آہنگ بھی کرتا ہے اور فن کارانہ انداز سے اس کا اظہار بھی ۔

یوں تو جنس کا تمام انسانی شخصیت سے ہی گہرا رابطہ ہے اور مختلف افراد زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف اعصابی کیفیات کے تحت اس کا اظہار یا اس سے گریز کرتے ملتے ہیں ۔ اس لحاظ سے دیکھنے پر جنس سے وابستہ اظہار و گریز انسانی شخصیت کے سمندر میں اسی طرح مد و جزر پیدا کرتا ہے جیسے چاند سمندر میں ، فن کار اپنی طبعی حساسیت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اعصابیت کی بنا پر اظہار و گریز کے اس مد و جزر کو اپنی تخلیقی شخصیت

کا جزو بنا کر تخلیقات کی صورت میں ابلاغ سے جو ارتفاع حاصل کرتا ہے وہ اس کے لئے ایک خاص نوع کی نفسی آسودگی کا باعث بنتا ہے، تنہا انسان کے لئے جنسی آسودگی اور بھی شدت اختیار کر لیتی ہے عورت ہے تو وہ یہ کہے گی۔

میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں
پتھر سے وصال مانگتی ہوں۔

(فہمیدہ ریاض)

مرد ہے تو میراجی کی مانند "لب جوئبار" سے فینٹسی کی دنیا آباد کرے گا مگر یہ حاصل ہوگا:

لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا
ہاتھ آلودہ و نمدار ہے دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھ کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے

ہر دو صورتوں کا نتیجہ: عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا ——— ایسا نکلتا ہے

تنہا مرد کی جنسی آسودگی کے نقطۂ نظر سے میں نے مجید امجد کا مطالعہ کیا تو یہ احساس ہوا کہ گو اس کے یہاں جنس پر واشگاف انداز میں لکھنے کا رجحان تو نہیں لیکن اسکے باوجود اس نے جنس کے بارے میں جو کچھ لکھا تنہا مرد کے ردِ عمل کے لحاظ سے وہ بیحد دلچسپ ہے۔ مجید امجد پر لکھتے وقت ناقدین کی اکثریت نے اس کی شاعری میں تنہائی کے شدید احساس کی طرف توجہ تو کی' لیکن اس سے جنم لینے والی اس فرسٹریشن کے تجزیہ کی کوشش نہ کی جس میں جنسی محرومی اہم ترین کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ "آٹوگراف" مجید امجد ہی کی نہیں بلکہ اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے' اس میں تنہائی کے بارے میں جس مرد کی تصویر اُبھرتی ہے وہ جنسی احساس کمتری کا شکار ہے۔ خوبصورت لڑکیاں کرکٹ کے ہیرو کے گرد منڈلا رہی ہیں' اس لئے رشک و حسد کے جو جذبات اُبھرتے ہیں یہ نظم ان کا فوری ردِ عمل معلوم ہوتی ہے لیکن ان کے پیچھے محرومی کی کتنی طویل داستان ہوگی یہ کون جانے؟

عورت سے محروم یا ویسے ہی محروم شخص جنسی لذت کے لئے جو ذرائع اپناتا ہے

ان میں تنوع کے ہزار انداز ملتے ہیں ان میں ننگی تصویروں سے دل بہلانا غالباً تسکین کا سب سے زیادہ بے ضرر انداز ہے اور شاید ہی کوئی ایسی بدقسمت عورت یا مرد ہوگا جس نے "پلے برائے" قسم کے رسالوں میں چھپی تصویروں سے بقدرِ ظرف لذت حاصل نہ کی ہو۔ مجید امجد کی نظم "برہنہ" کا یہی موضوع ہے۔ کوئی کمتر ذہنی سطح یا ہلکی تخلیقی صلاحیتوں کا شاعر ہوتا تو اسے اپنے تنے اعصاب کی تسکین کے لئے PORNOGRAPHIC بنا دیتا، لیکن مجید امجد فن کی جس بلند سطح پر تھا اس کی بنا پر اس نے نظم میں ——— "SENSOUSNESS" تو پیدا کی لیکن اسے واشگاف بنا کر لذت کی دلدل نہ بنایا چنانچہ نظم کا مجموعی تاثر وہ ہے جسے سنسکرت تنقید کی اصطلاح میں "رس" سے تعبیر کیا جاتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کیلے بدن تیغ کی دھار جیسے
لہو رس میں گوندھے ہوئے جسم ریشم کے انبار جیسے
مگر جن پہ پھیلے وہ شانے وہ بانہیں
اٹھائیں، منور ڈھلائیں

ایسی تصاویر دیکھنے سے جو ردِ عمل ہوتا ہے اس کا اظہار مجید امجد نے دو طرح سے کیا ہے۔ ایک تو روایتی طور پر جسے دنیا کی بے ثباتی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے :

انہیں پھونک دے گی یہ بے مہر دنیا

یہ ردِ عمل کیوں [illegible] ہے اس لئے اس کا شاعر کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں، اصل ردِ عمل نظم [illegible] میں ہے یہ ذاتی اور حقیقی ہے اور اسی لئے نفسیاتی لحاظ سے بے حد اہم :

فرنگی جریدوں کے اوراق رنگیں
لو اک بار حیرت سے تک لو،
پھر ان کو حفاظت سے اپنے دلوں کے مقفل درازوں میں رکھ لو۔

"اک بار حیرت سے تک لو" میں جو بیکس چھپی ہے اور "دلوں کے مقفل درازوں" میں

جو امکانات پوشیدہ ہیں، میرے خیال میں ان پر بطورِ خاص زور دینے کی ضرورت نہیں کہ آپ حضرات خود بھی ماشاءاللہ اہلِ دل ہیں۔

جنسی اظہار کے لحاظ سے مجید امجد کی دو اور نظمیں "ایکٹریس کا کنٹریکٹ" اور "ایک فلم دیکھ کر" بھی خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔ "ایکٹریس کا کنٹریکٹ" گو اس تلخ حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ کس طرح قیمت کا ٹیگ لگا کر عورت کو بکاؤ مال بنا دیا جاتا ہے۔ عورت کی کمرشل حیثیت کا راز اس مصرع میں مضمر ہے۔

مرا وجود مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ!

جہاں تک دوسری نظم "ایک فلم دیکھ کر" کا تعلق ہے تو اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ غالباً کسی STRIPTEASE فلم کا تاثر ہے۔ کیوں کہ اگر یہ ہر فلم ہوتی تو یوں نہ لکھتا۔

لچکتی اس کے بدن کی ڈھال
اک اک تیز لذت کے ساتھ
اک اک بندھن اترا
پلّو ڈھلک کر، رک کے، گرے"!

دونوں نظمیں ملا کر پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ ایک کہانی کے دو باب ہیں (ویسے کتاب میں یہ دونوں نظمیں ساتھ ساتھ درج ہیں) اس کہانی کا بنیادی کردار پیشہ ور عورت ہے۔ پہلی نظم میں وہ ایکٹریس بن کر خود دعوت دیتی ہے کیسی دعوت اور اس کی تکمیل کس انداز میں ہوگی یہ دوسری نظم میں اُجاگر ہوتا ہے جب ایکٹریس نے یہ کہا:

" اکائیوں کے ادھر جتنے دائرے ہوں گے،
ادھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے"

تو اس وعدہ کی تکمیل دوسری نظم "اسٹرپ ٹیز" میں یوں ہوتی ہے:

سامنے اک
جگ مگ جسم

گرتی مڑتی ٹوٹ کر جڑتی، مرمر کی ڈھلوان
سب کچھ قاشیں، رگیں، خلیے، ماس، مسام
سب کچھ ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو
سب کچھ جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دُنیا۔
گول، سڈول کٹورے انمول زمینیں، ساحل، جھرنے، دھوپ
چاندنی، مخمل، پھول،
عورت کے جسم کی تمام عمر پرستش کے باوجود میرا جی بھی یہاں تک نہ پہنچ پایا۔

سراج منیر

سوچ لہکتی ڈال

"لفظ کہ جن میں ہمارے دلوں کی بیتیاں ہیں کیا وہ ہمارے کچھ بھی نہ
کر سکنے کا کفارہ بن سکتے ہیں"۔

تخلیقی عمل اور معروضی دنیا میں اسکی حیثیت کے تعین کے بارے میں یہ سوال ہمارے لئے اہم ترین ٹھہرتا ہے اور یہ سوال صرف اسی ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا جس نے دلوں کی بیتیوں سے بھرپور لفظ لکھے ہوں اور اس بیت کے کفارہ بن سکنے کے بارے میں بھی ایک تشکیلی الجھن فنا کے بنیادی احساس کی گواہی ہے۔ بہرحال آج جب ہم ایک بات بہت ذمہ داری سے کہتے ہیں کہ مجید امجد اردو کی تاریخ میں اقبال کے بعد اہم ترین نام ہے تو عموماً کچھ ایسے حضرات جنہوں نے شبِ رفتہ کا بھی محض ایک سرسری مطالعہ کیا ہے، ناک بھوں چڑھاتے ہوئے ایک اندازِ بے نیازی سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہ شاعر جس کے کلام کا غالب حصہ ابھی تک سامنے نہ آیا ہو اور جسے اب تک (بقول انہیں کے) قبولیت عام نہ حاصل ہوئی ہو بھلا شعری تاریخ میں اتنی اہم حیثیت کا حامل کس طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس صورتِ میں ضروری ٹھہرتا ہے کہ مجید امجد کی شعری کاوشوں کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے اور اردو شاعری کے پس منظر و امکانات میں مجید امجد کی تفہیم کی جائے۔ لیکن اس کوشش کے لئے ضروری ہے چند بنیادی باتوں پر ہم اپنا موقف واضح کر دیں۔

۱۔ پاپولر شاعری اور بڑی شاعری میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے کہ پاپولر شاعری اور موجود جذباتی سانچوں کو ان کی اپنی حیثیت میں دریافت کرتی ہے جبکہ ایسی شاعری جو پورے شعری امکان میں ایک نئی جہت تلاش کرے، دراصل نئے ذہنی اور جذباتی منطقوں کی دریافت کرتے ہوئے ایک ایسی سطح دیتی ہے جس کا فوری تعلق عہد کے شعراء سے ہوتا ہے۔

۲۔ شعری کاوشوں کا منظرِ عام پر آنا نہ آنا ایک غیر متعلق امر ہے اس لئے کہ نیا تجربہ ایک پورے دور کی فضا میں شامل ہوتا ہے اور جو شاعر اس دور کے طرزِ احساس کو بتمام و کمال دریافت کرلے اس کی شاعری کے چھوٹے سے حصے میں بھی اس تجربات اور امکانات کی جہت اجمالاً موجود ہوتی ہے۔

یہ دو مفروضے دراصل مختلف زبانوں کے ادب کی تاریخ کے شواہد پر مبنی ہیں۔ خود اردو میں بہت سارے اہم شاعر ہمیں ایسے مل جاتے ہیں جن کا پورا شعری سرمایہ دریافت ہونے میں دیر تو لگ گئی لیکن جو تجربے ان کے پورے کام کے ایک حصے میں ظاہر ہوتے تھے وہ ان کی جہت کا تعین کر گئے اور اس کے ساتھ ہی پوری شاعری کو ایک نیا رخ عطا کر گئے۔

بہر حال مجید امجد کی دو کتابیں اب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں یا ان کی زندگی میں ہی غیر مسلسل انداز میں جو چیزیں چھپنے لگ گئی تھیں اس وقت ہی یہ ظاہر تھا کہ اردو شاعری نے طرزِ ادراک کا ایک نیا نظام دریافت کر لیا ہے اور یہ دریافت ماضی کے زندہ تجربات کا نچوڑ اور مستقبل کے مستور امکانات کا اشاریہ ہے۔

اصل میں شاعر کی حیثیت کے تعین کا دارومدار بھی ان ہی دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ مجید امجد کے ہاں ماضی کے سارے زندہ تجربات جس تخلیقی انداز میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں ان کا تذکرہ کرنا اور شواہد فراہم کرنا تحصیل حاصل

ہے' (یہ اور بات کہ یہ تحصیلِ حاصل میں اپنے ایک مضمون میں پہلے کر چکا ہوں) رہ گئی مستقبل کے امکانات کے تعین کی بات تو اس سلسلے میں دو چار اہم باتیں۔ جب بھی کوئی نئی شعری شکل کسی شاعری میں جنم لیتی ہے اس کی اولین حیثیت ہئیت (FARM) کی نہیں بلکہ ساخت (SHAPE) کی ہوتی ہے۔ اس اولین دریافت اور پھر اس کے بعد کا پورا سفر دراصل ساخت سے ہئیت تک پہنچنے کا سفر ہوتا ہے اور جس شخصیت میں یہ سفر تکمیل پائے یعنی ساخت کا تعین کرنے والا جوہر اور ساخت ہم آہنگ ہو جائیں اسے ہم تاریخ۔ منبتی ہوئی۔ شخصیت MAN BECOMING HISTORY کہتے ہیں۔ یعنی شعری تاریخ کا موجود اور ممکن اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں اور اس نکتے پر آکر شاعری اپنے کچھ اسالیب باطل کرتی ہے اور کچھ نئے اسالیب طے کرتی ہے اور پھر دوبارہ ساخت اور ہئیت کی جدلیات میں اپنا ارتقا ڈھونڈتی ہے۔ چنانچہ بڑی شاعری اور محض اچھی شاعری میں بنیادی فرق یہی ہے کہ بنیادی شاعری ایک ہئیت کے امکانات کو بروئے کار لاتی ہے اور محض اچھی شاعری انہیں تفصیلاً ایک کینوس پر منتقل کرتی ہے اور اس طرح ایک حیثیت میں اس کے شارح کا رول ادا کرتی ہے۔

بہرحال مجید امجد کو اردو شاعری کے سیاق و سباق میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی شاعری کے ان وجودیاتی تعین کیا جائے جن کو ہم ان کے شعری وجود کا گوہر گردانتے ہیں اور پھر اس کے بعد دلائل۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ چند حقائق ذہن میں رکھنے ضروری ہیں۔

ا۔ مجید امجد کا پہلا بنیادی مسئلہ نظم کے مختلف اشکال رہے ہیں جس کی گواہی شب رفتہ میں شامل ان کا یہ جملہ دیتا ہے۔

"میں ایک عمر نظم اور اس کے گوناگوں اشکال کا سوداتی رہا ہوں"

مجید امجد کے ذہن میں نظم کی اشکال کا جو تصور اور اس کے جو

تعینات ہیں ان پر ذرا آگے ہم گفتگو کریں گے کہ ان کے پورے شعری سفر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اشکال کا مطلب بہر حال وہ ہرگز نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہئیتِ محض کے پرستار لیتے ہیں۔

۲۔ مجید امجد کے ہاں اردو نظم میں پہلی مرتبہ فنا کا احساس ایک ایسی تخلیقی سطح پر ظاہر ہوا ہے اور ان کے پورے شعری وژن کے تعین کے سلسلے میں اس احساس کی بنیادی حیثیت ہے۔ اسکی اہمیت کا تذکرہ کرنے سے پہلے اس کے تصور کی وضاحت کے لئے ایک اقتباس

"نہ کوئی سقف منقش، نہ کوئی چتر حریر
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس ایک تودۂ خاک!
بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجوم کرمکِ کور
بس ایک قبۂ گور
یہیں پہ دفن ہے وہ جسم وہ روایتِ خاک
وہ دل کہ جس کے دھڑکتے ہوئے بیانِ الم
کو چھو سکا نہ قلم"

چنانچہ نظم کی مختلف اشکال کے سلسلے میں مجید امجد کا سفر در اصل آزاد نظم کے اس باطن کی دریافت کا عمل ہے جہاں آ کر ساخت اور ہئیت ایک ہوتے ہیں۔ نیز اس بات سے ہماری مراد یہ ہے کہ آزاد نظم جس وقت مجید امجد تک پہنچی اس کی حیثیت محض ایک ساخت کی تھی اور یہ زیادہ تر اسی طرزِ احساس کے تحت لکھی جا رہی تھی جس پر اقبال کا پورا مثبت یا معکوسی طور پر لہجہ سایہ فگن تھا۔ عروض کے اس

نئے امکان کا جوہر کہ تجربے کی تنظیم کے ایک نئے اصول سے عبارت تھا اب تک دریافت نہ ہوا تھا اور مجید امجد کے نزدیک نظم کا ہر سٹرکچر دراصل تجربے کی تنظیم کے ایک نئے اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا کے بیان کے مطابق اپنی آخری نظموں کے بارے میں مجید امجد نے یہ کہا کہ میں نے ان کی عروضی حیثیت ایسی بنائی ہے کہ یہ نظمیں تیزی سے نہ پڑھی جائیں کہ ان میں تجربے کی نوعیت ایسی ہے کہ ان نظموں کو رک رک کر پڑھا جائے الفاظ شاید یہ نہ رہے ہوں مگر غالباً مراد یہی تھی۔ بہرحال مجید امجد کے ہاں نظم کی اشکال کا جو ایک زینہ بہ زینہ سفر نظر آتا ہے وہ دراصل تجربہ در تجربہ نئے امکانات اور نئی تنظیم اور معانی کے نئے پیٹرن کی کلیت کا نام ہے اور یہ سلسلہ بڑھتا ہوا ان کی آخری دور کی ان نظموں تک آیا ہے ہماری رسائی یہیں ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد نظم کا ظہور تجربے کے جس نئے سٹرکچر کے لئے ہوا تھا اسے مجید امجد نے کلیتاً دریافت کیا اور یہاں آکر داخلی ہئیت موضوع اور تجربے کی نوعیت کو محیط ہے۔ خارجی ساخت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس طرح نظم مجرد تفکرات میں تجربے کے REDUCTION کے عمل سے آگے بڑھ کر ایک شے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ بہرحال یہ وہ اسلوبیاتی انداز تھا جو مجید امجد نے چنا اور اس سے پہلی مرتبہ ہمارے ہاں نظم ایک ذہنی اور جذباتی روداد کی حیثیت سے آگے بڑھ کر خود خارجی دنیا میں جذبہ یا فکر بن گئی۔

A POEM SHOULD NOT MEAN BUT BE

یہاں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اس ایک درویش نے شاعری کو معروضی دنیا میں باطنی حقیقت کی گواہی کی حیثیت سے ہٹا کر بذاتہ حقیقت بنا دیا۔ چنانچہ اس طرح اپنے جوہر میں شاعری کی کائنات شئیت (THINGNESS) کی حدود میں داخل ہو گئی۔ یہ تو خیر ان کے شعری اسلوبیات کی بات ہوئی اب

اس کی متوازی حقیقت کی طرف آیئے یعنی فنا کے وژن کی طرف۔

مجید امجد پر لکھنے والے تقریباً تمام حضرات نے اس بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعضوں نے تو اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوئی تفصیلی گفتگو کرنے اور غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بجائے دو تین ایسی باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو یہاں ضروری ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ فنا ایک ایسے "لازمی امکان" کا نام ہے جو زندگی کے سارے امکانات کا خاتمہ کر دیتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان تمام امکانات کو معنی بھی دیتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں بنیادی علامتوں نے "قبر گور" سے ہی جنم لیا ہے۔ اس طرح دو باتیں سامنے آئیں فنا کے احساس سے ایک تو زندگی کے تمام امکانات کو معنی ملتے ہیں دوسرے علامت کی تخلیق بھی یہیں سے ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ موت تمام امکانات کو بالآخر ختم کر دیتی ہے اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ زندگی کے معنی اپنے اندر سے دریافت کئے جائیں اور اس معنی کی دریافت کا عمل ایمان کہلاتا ہے۔ جہاں سے لفظوں کی ہیئتیں جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ فنا کا شدید احساس مجید امجد کے ہاں دراصل ان کی اسلوبیات سے ہی متعلق ایک امر ہے۔ یعنی اب نظم محض علامت نہیں رہ گئی ہے کہ اپنی شیئیت گم کر کے اپنے سے خارج میں کسی شے کی طرف اشارہ کرے اور ختم ہو جائے بلکہ ایک شے کی حیثیت میں قائم ایک نشانی ہے اور اس کی بنیاد وہ ایمان ہے جو زندگی کرنے کے عمل کو جاری رکھتا ہے سو اس جوکھم سے گزرنے کے پراسس پر ایک نظر۔

میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے جسم کے گارے میں گندھی
ایک نوحس تپش ایسی بھی تو ہے جس کے سبب
روح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے
سانس کے بل میں سینے کی سکت بنتی ہے

ڈٹتی کڑیوں میں جینے کے جتن جڑتے ہیں
ہیں یہ اب کس کو بتاؤں کو مرے جسم کے ریشوں کے اس
الجھاؤ میں ہے
ایک وہ گرتی سنبھلتی ہوئی، نازک سی دھڑکتی ہوئی لہر
جو ہر اک دکھ کی دوا ڈھونڈتی ہے
جو عجب حیلوں وسیلوں سے گزرتے ہوئے لمحوں کے قدم
روکتی ہے

چنانچہ اب اس حل کا جائزہ اردو شاعری کے پورے پس منظر میں اہم یوں ہے کہ میر کے بعد سے ہی "زندگی کرنے" کا یہ حل گم ہو چکا تھا جو مجید امجد کے ہاں آکر ایک نئے ڈھنگ میں دریافت ہوتا ہے اور یہاں سے پھر زندگی کی وہ پوری صورتِ حال اس طرز احساس کے باطن کا مسئلہ بن جاتی ہے اور اردو شاعری کے منظر نامے میں زندگی کی ٹوٹتی کڑیوں میں ایمان کے بل پر اس طرح جینے کے جتن جڑتے ہیں جیسے دلوں کی بیتوں میں لفظ جڑ جاتے ہیں اور نظم جنم لیتی ہے۔

چنانچہ ایک نظر اس سفر پر جو ہم نے مجید امجد کی تفہیم کے سلسلے میں طے کیا۔

۱ ۔ مجید امجد کے ہاں نظم آزاد نے ساخت کے بجائے ہیئت کا درجہ اختیار کیا اور اس طرح ساخت اور ہیئت کی دوئی نظم کے باطن میں حل ہو گئی۔

۲ ۔ نظم نے باطن کے کسی تجربے کے معروضی جزو تکمیلی (OBJECTIVE COUNTERPA T) کی حیثیت سے آگے بڑھ کر خارجی دنیا میں باطن کے فی نفسہٖ ظہور کی حیثیت حاصل کی اور اپنی لسانی حیثیت میں وہ خارجی مظہر ٹھہری جو موضوع کے لئے بذاتہٖ ایک تجربہ ہے، گویا ـــ

INTERNALIZATION OF THE EXTERNAL AND

EXTERNALIZATION OF THE INTERNAL

کا ایک نیا رشتہ قائم ہوا اور شاعر اور اس کی شعری کائنات ایک وحدت میں گندھ گئے۔
چنانچہ اگر یہ ساری باتیں کسی نئے شعری منطقے سے تعلق رکھتی ہیں پھر تو مجید امجد کے بارے میں ہم وہ بات پھر اسی تیقن سے دہرا سکتے ہیں کہ اردو کی شعری تاریخ میں مجید امجد اپنی کائنات لے کر آئے تھے اور اب اس کی دریافت کا عمل شاعری کا سفر ہوگا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس عمل میں مجید امجد کا رشتہ اپنے پیشروؤں سے ایک تکمیلی رشتہ ہے نہ کہ تردیدی۔ اور اب سوچنے کا مقام ہے کہ جب ہم اس شعری دائرے میں داخل ہو چکے ہیں تو لفظوں میں دلوں کی وہ بیتیں کہاں ہیں جن سے ہم پوچھ سکیں کہ کیا وہ ہمارے کچھ نہ کر سکنے کا کفارہ بن سکتے ہیں۔

سانس کی مہلت

پیدائش ——— ۲۹ جون ۱۹۱۴ء بمقام جھنگ
وفات ——— ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء بمقام ساہیوال
تصنیف ——— شبِ رفتہ، شبِ رفتہ کے بعد
انتخاب ——— مرے خدا مرے دل
ان گنت سورج، چراغِ طاقِ جہاں

والد کا نام میاں علی محمد، انہوں نے مجید امجد کی والدہ کی موجودگی میں دوسری شادی کرلی اس وقت مجید امجد بہت کم سن تھے۔ چنانچہ ان کی والدہ اپنے میکے چلی گئیں۔ مجید امجد کے نانا میاں نور محمد نہایت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ انہیں کے زیرِ سایہ مجید امجد نے فارسی و عربی کی مبادیات کا درس لیا اور ایک آدھ کتاب طب کی بھی پڑھی، باپ کی شفقت و سرپرستی نے محرومی و تلخی ان کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ ماموں کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ ان کی بیگم ہیڈ مسٹریس ہائی اسکول کے عہدے سے ریٹائر ہوتی ہیں اور نورِ بصیرت سے قطعی محروم ہوچکی ہیں۔

مجید امجد کی کوئی اولاد نہیں اور نہ کوئی حقیقی بھائی ہے۔ البتہ ان کے دو سوتیلے بھائی اور ایک بہن بقید حیات ہیں۔

مجید امجد کی ابتدائی تعلیم جھنگ میں ہوئی وہیں سے انہوں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان پاس کئے اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ ادبی زندگی کا آغاز ۹ سال کی عمر سے ہوا۔ کئی سال تک نیم سرکاری رسالہ "عروج" جھنگ کے مدیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ ساہیوال میں تقریباً ۲۹ سال اُن کا قیام رہا۔ اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے دو سال قبل ریٹائر ہوئے تھے۔ وفات سے دو ماہ قبل مرکزی حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ صرف ان کا ایک شعری مجموعہ "شبِ رفتہ" ان کی زندگی میں شائع ہو سکا تھا۔

ان کی وفات انتہائی صبر آزما حالات میں واقع ہوئی۔ ۱۱ مئی ۷۴ء کو ۹ بجے صبح اور ۲ بجے دن کے درمیانی وقفہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا ایک پرانا رفیق علی محمد چپراسی ان کی ہدایت پر مکان کے باہر تالا ڈال دیتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا اور جب دو بجے وہ واپس آیا تو ان کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ جناب جاوید احمد قریشی کی نگرانی میں ان کی میت ٹرک کے ذریعہ جھنگ لے جائی گئی۔ ہمراہ جانے والوں میں کوئی شاعر، ادیب یا ان کا مداح و قدر داں نہیں تھا۔ بجز محمد علی کے تدفین ۱۲ مئی ۱۹۷۴ء کو جھنگ میں عمل میں آئی، جس میں بمشکل پچیس تیس حضرات موجود ہوں گے۔

مجید امجد نے ساری عمر تنہا زندگی بسر کی۔ وہ بہت کم گو تھے۔ ان کا کوئی حقیقی دوست نہیں تھا۔ وہ صرف شعر کہنے کے لئے زندہ تھے۔ والدہ مرحومہ پر ان کی ایک نظم نہایت بلند پایہ اور کربناک احساسات کی مظہر ہے۔ ساری عمر ان کے ارادت مند اور ادیب و شاعر ان سے فیضیاب ہوتے رہے لیکن انہوں نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ دفتر سے گھر یا اسٹیڈیم ہوٹل یا پھر بزم فکر و ادب کی لائبریری، ان کی محدود زندگی کا مرکز تھے۔ وفات کے بعد ساہیوال کی مشہور تفریح گاہ "کمپنی پارک" اور "ساہیوال ہال"

کا نام تبدیل کر کے "امجد پارک" اور "امجد ہال" رکھا گیا ہے۔

ان کی وفات کے بعد "نصرت" "مساوات" اور رسالہ "قند" نے خصوصی شمارے شائع کئے۔ قند کا مجید امجد نمبر اس لحاظ سے اہمیت رکھتا تھا کہ اس میں پہلی بار مجید امجد کی شخصیت و فن کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا گیا اور اس کی نظم و نثر کا ایک جامع انتخاب بھی شائع کیا گیا۔ بعد ازاں اسی سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے رسائل میں بکھری ہوئی نظموں، غزلوں کا انتخاب "مرے خدا مرے دل" شائع کیا گیا۔ قند کا مجید امجد نمبر اب کتابی صورت میں "مجید امجد ۔ شخص و شاعر" کے نام سے شائع ہونیوالا ہے۔ گذشتہ برس اسی قسم کا ایک مجموعہ "گلاب کے پھول" کے نام سے حیات محمد سیال نے بھی مرتب کر کے شائع کیا جس میں ان کی شاعری کے علاوہ ان کے فن اور شخصیت پر مضامین بھی ہیں جبکہ کئی تحریریں قند کے خصوصی شمارے سے لی گئی ہیں۔ حال ہی میں امجد کی شاعری کا ایک انتخاب خواجہ محمد ذکریا نے مرتب کر کے شائع کرایا ہے جس میں کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی شامل ہیں۔ زیرِ نظر انتخاب میں نظم تارے اور نوحہ ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ تارے اور نوحہ قند کے مجید امجد نمبر سے لی گئی ہیں۔

—— مرتب

مجید امجد کا ایک نوحہ

جلیل حشمی

ابد سے خاکِ مقدس کو آشنا کرکے
گلیم پوش گیا! شہر میں صدا کرکے

نہ مدح کرکے نہ توصیف اور ثنا کرکے
نہ ذکرِ جاں نہ غمِ دہر کا گلہ کرکے

کھنک گئیں جسمِ دوراں پہ چوڑیاں یارو
اُٹھا وہ بزم سے کیسا سخن ادا کرکے

پڑے مقام جو پستی کے راہِ ہستی میں
تو اس نے روشنیاں اوڑھ لیں قبا کرکے

کوئی سوال کرو اس اُداس حجرے سے
یہاں سے مروت گئی ہے کدھر کو کیا کرکے؟

لہو کشید کیا اس نے اپنی رگ رگ سے
دیارِ خاک میں جینے کا فیصلہ کرکے

اٹک اٹک گئیں بادل میں سونٹیاں اُس کی
اٹھا جو خاک سے آفاق کو صدا کر کے

بہر فقیر کا آبِ رواں نہ تھا لیکن
نقوش چھوڑ گیا سنگ پر، وفا کر کے

چراغ لے کے گیا مقتلِ تمنا میں
یہ کس کو دیکھ لیا اُس نے بے قبا کر کے

نشیبِ زینۂ ایام سے قدم بہ قدم
ہوا طلوع شعاعوں کا قد بڑا کر کے

سمیٹتا رہا خاکسترِ تمنا بھی
ملا بھی راہ میں چہرے کو آشنا کر کے

وہ ارضِ جاں میں بہشتوں کا ڈھونڈنے والا
لبوں سے زہر لگاتا رہا دوا کر کے

گیا شکوہِ دو عالم کے مرحلوں سے گزر
نحیف ہاتھ میں افعی کو وہ عصا کر کے

گیا وہ پرسشِ و بالیں سے بے نیاز فقیر
گیا گیا وہ فقیری کا حق ادا کر کے

وہ گدڑیوں میں سمٹتا فقیر تھا لیکن
زمیں کو دیکھتا کیا نقشِ بوریا کر کے

مہک اٹھا وہ دل و جاں پہ زخم کھا کھا کر
چلا ہوا کی طرح خاک کو ہرا کر کے

درِ زمانہ پہ علقہ زنی نہ کر پایا
گزر گیا وہ اسے بھی تو نقش پا کر کے

شہیدِ معرکۂ جاں سلام ہو تجھ پر
تو لے گیا غمِ ہستی بھی خوں بہا کر کے

شمارِ زخم کی فرصت میں خوں فشانی کی
وہ لب کشا نہ ہوا حرمتِ رضا کر کے

کبھی تو مرگِ نہالانِ رہگذر پہ اداس
ہنسا ہے بھید قلم کو کبھی عطا کر کے

وہ اک چراغ کہ طاقِ جہاں میں لرزاں ہے
اسے نہ دیکھ شب و روز سے جدا کر کے

کسے مجال کہ دو گام اس کے ساتھ چلے
مسافرت میں رہا خود کو بے نوا کر کے

وہ مہرِ انجمن جاں نشیب خلوت میں
ہوا غروب مگر دن کی ابتدا کر کے

مگر سلام رفیقاں نہ بھول سکے پایا
وطن میں مرگ غریبی کا سامنا کر کے

ہوا مسافرِ دشت وجودِ تن تنہا
نہ ظلمتوں سے نہ سورج سے مشورہ کر کے

لہو لہو تھی مگر لوحِ آرزو اس کی
قلم سے پھول بکھیرے ہیں حوصلہ کر کے

چٹان پر بھی نظر آئیں تتلیاں اس کو
گیا وہ خوب تماشا جمال کا کر کے

لگا ہے دامنِ یارانِ شہر پر وہ داغ
کہ سوچتے ہیں اسے سر کو خم ذرا کر کے

کوئی گلہ کوئی شکوہ تو کر لیا ہوتا
کہ شرمسار ہے یہ انجمن خطا کر کے

پکارتی رہی اس کے نفس میں نَے حشمی
وہ لمحہ لمحہ جیا حشرِ جاں بپا کر کے

اور اب یہ کہتا ہوں یہ جرم بھی روا رکھتا
میں عمر اپنے لئے بھی تو کچھ بچا رکھتا

—— مجید امجد

شبِ رفتہ

فنونِ مجید امجد نمبر

مرے خدا مرے دل

شبِ رفتہ کے بعد

گلاب کے پھول

ان گنت سورج

چراغِ طاقِ جہاں

۱۹۵۸ سے ۱۹۸۰ء تک

حرفِ زبوں کے رنگ نیارے

کتنی چھنا چھن ناچتی صدیاں
کتنے گھنا گھن گھومتے عالم
کتنے مراحل —
جن کا مآل — اک سانس کی مہلت —

سانس کی مہلت — عمرِ گریزاں —
جس کی لرزتی روشنیوں میں
جھلمل جھلمل
جھلکے اک مسحور مسافت!
حدِ نظر تک، وسعتِ دوراں!
جس کی خونیں سطح پہ تڑپے
طوق و سلاسل
میں جکڑی، انساں کی قسمت

یہ اشکوں آہوں کی دنیا
اس منڈلی میں پیہم دھڑکے
سازِ غمِ دل
پیہم باجے، درد کی نوبت

یہ جلتے لمحوں کا الاؤ
اس جیون میں، غم، دم خنجر
دکھ سمِ قاتل

میں سنے پیالے بھر بھر سے امرت!
کیسے کیسے عجب زمانے
یگ یگ شعلے تٹ تٹ طوفاں
اور مرا دل
بجھتے جگوں کی راکھ میں لت پت!

بسری یادوں کی بستی کے
بند کواڑوں سے ٹکرانا
میں اک سائل
میرا رزق، سسکتی چاہت!

شہرِ جنوں کے رنگ نیارے
گلیاں موڑ، منڈیریں، دوارے
منزل منزل
ارمانوں کی بچھڑتی سنگت!

دور کہیں اس پار وہ دنیا
آرزوؤں کا دیس کہ جس کی
راہ میں حائل
آنکھ کی جھیلیں، دھوئیں کے پربت،

دردوں کے اس کوہِ گراں سے
میں نے تراشی نظم کے ایواں
کی اک اک سِل
اک اک سوچ کی حیراں مُورت!
تجربہ ہائے زیست کے آرے
تلخیٔ صد احساس کے تیشے
ان کے مقابل
حرفِ زبوں — اک کاغذ کی لعبت!

عمر اسی الجھن میں گذری،
کیا شے ہے یہ حرف و بیاں کا
عقدۂ مشکل؟
صورتِ معنی؟ معنیٔ صورت؟

اکثر گردِ سخن سے نہ ابھرے
وادیٔ فکر کی لیلاؤں کے
جھومتے محمل!
طے نہ ہوا ویرانۂ حیرت!

گرچہ قلم کی نوک سے ٹپکے
کتنے ترانے، کتنے فسانے
لاکھ مسائل
دل میں رہی سب دل کی حکایت!

بیس برس کی کاوشِ پیہم
سوچتے دن اور جاگتی راتیں
ان کا حاصل:
ایک یہی اظہار کی حسرت!

کنواں

کنواں چل رہا ہے، مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں، نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ!
نہ شاخوں کی باہیں، نہ پھولوں کے مکھڑے، نہ کلیوں کے ماتھے، نہ رُت کی جوانی
گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتا تیز خوں رنگ پانی
کہ جس طرح زخموں کی دکھتی تپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی
اُدھر دھیری دھیری
کنوئیں کی نفیری

ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانہ
پُراسرار گانا
بجے گسن کے رقصاں ہے اندھے تھکے ہارے بیجان بیلوں کا جوڑا بیچارا
گراں بار زنجیریں، بھاری سلاسل، کڑکتے ہوئے آتشیں تازیانے
طویل اور لامنتہی راستے پر بچھا رکھے ہیں دام اپنے فضا نے
اُدھر وہ مصیبت کے ساتھی ملاتے ہوئے سینگوں سے سینگ، شانوں سے شانے
رواں ہیں نہ جانے
کدھر؟ کس ٹھکانے

نہ رکنے کی تاب اور نہ چلنے کا یارا
مقدر سیہ کارا

کنوئیں والا گادی پہ لیٹا ہے مست اپنی بنسی کی میٹھی، سریلی صدائیں
کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہہ گئی ایک ہی تند ریلے کی فیاض لہروں میں کیاری کی کیاری
کہیں ہو گئیں دھول میں دھول لاکھوں رنگا رنگ فصلیں، ثمر وار، ساری
پریشاں، پریشاں
گریزاں، گریزاں

تڑپتی ہیں خوشبوئیں دامِ ہوا میں
نظامِ فنا میں

اور اک نغمۂ سرمدی کان میں آ رہا ہے، مسلسل کنواں چل رہا ہے!
پیاپے مگر نرم رو اس کی رفتار، پیہم مگر بے تکان اس کی گردش
عدم سے ازل تک، ازل سے ابد تک، بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش
نجانے لئے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش
رواں ہے رواں ہے
طپاں ہے طپاں ہے

یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے
کنواں چل رہا ہے

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی، سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار، اک تیز موڑ — اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پَر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخلِ بلند!
تھام کر جس کو، گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سیکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں

آہ — اِن گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنہیں حاصل نہیں

امروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پہ مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی اَن سُنی، دائمی راگنی کی کوئی تان ——— آزردہ، آوارہ، برباد
جو دم بھر کو رُک کر، مری اُلجھی اُلجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد.....
طلوع و غروبِ مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں!
یہ کچھ تھرتھراتے اُجالوں کا رومان، یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصّہ
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں میں ہوں
یہی میرا حصّہ ——— ازل سے ابد تک خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصّہ
مجھے کیا خبر ——— وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیّوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے، زمانوں کے ہنگامے، صدیوں کے صدہا ہیولے
مجھے کیا تعلق ——— مری آخری سانس کے بعد بھی، دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لمحۂ مختصر ——— جو میری زندگی، میرا زادِ سفر ہے
مرے ساتھ ہے، میرے بس میں ہے، میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ!
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لئے اس خراباتِ شام و سحر میں یہی کچھ!
یہ اک مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی، یہ اک فرصتِ کوششِ آہ و نالہ

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر!
بہ دورِ حیات آ گئی ہے، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا، جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے،
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں،
یہ دنیائے امروز، میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

توسیعِ شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اِس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بِک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، چھٹتے پنجر، جھڑتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
اس پر بھی اب — کاری ضرب اک — اے آدم کی آل

ریوڑ

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
ایک ریوڑ کے تھکے قدموں کا مدھم آہنگ
جس کی ہر لہر اندھیروں میں لڑھک جاتی ہے

بکریاں دشت کی مہکار میں گوندھا ہوا دودھ
چھاگلوں میں لئے جب رقص کناں آتی ہیں
کوئی چوڑی خمِ دوراں پہ چھنک آتی ہے

مست چرواہا، چراگاہ کی اک چوٹی سے!
جب اترتا ہے تو زیتون کی لانبی سونٹی
کسی جلتی ہوئی بدلی میں اٹک جاتی ہے

جست بھرتی ہے کبھی اور کبھی چلتے چلتے
ناچتی ڈار مہکتے ہوئے سبز غالوں کی
ہر جھکی شاخ کی چوکھٹ پہ ٹھٹھک جاتی ہے

سان پر لا کے چھری، سیخ پہ صد پارۂ گوشت
پھر بھی مدہوش غزالوں کی یہ ٹولی ہے کہ جو
بار بار اپنے خطرہ سے بھٹک جاتی ہے!

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
کھیلتی ہے غمِ ہستی کی وہ شاداں سی امنگ
جس کی رو وقت کی پہنائیوں تک جاتی ہے

آٹوگراف

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر حسین لڑکیاں

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اُٹھے
اُبل پڑے اُلجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پُر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مُڑے، بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی راستے پہ اک طرف
بیاضِ آرزو بکف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بہ دم
کمانِ ابرواں کا خم

کسی عظیم شخصیت کی تمکنت
حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی

کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا
حروفِ کج تراش کی لکیر سی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی!

وہ بادل، ایک مہوشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر
بصد غرورِ کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں — دکٹ، اگری!

میں اجنبی میں بے نشاں
میں پابہ گِل
نہ رفعتِ مقام ہے نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

برہنہ

فرنگی جریدوں کے اوراقِ رنگیں
پہ ہنستی، لچکتی، دھڑکتی لکیریں
کسیلے بدن تیغ کی دھار جیسے
لہو رس میں گوندھے ہوئے جسم، ریشم کے انبار جیسے

نگہ جن پہ پھسلے، وہ شانے وہ باہیں
مدوّر اٹھانیں، منوّر ڈھلانیں
ہر اک نقش میں زیست کی تازگی ہے
ہر اک انگ سے کھولتی آرزوؤں کی آنچ آ رہی ہے

خطوطِ برہنہ کے ان آئنوں میں
حسیں پیکروں کے یہ شفاف خلکے
کہ جن کے سجل روپ میں کھیلتی ہیں
وہ خوشیاں جو صدیوں سے اوجھل کی اوجھل رہی ہیں!

انہیں پھونک دے گی یہ بے مہر دنیا
فرنگی جریدوں کے اوراق رنگیں
کو اک بار حسرت سے تک لو
پھر ان کو حفاظت سے، اپنے دلوں کی مقفل درازوں میں رکھ لو۔

مہکتے ، میٹھے ، مستانے ، زمانے
کب آئیں گے وہ من ملنے زمانے؟

جو میرے کنج دل میں گونجتے ہیں —
نہیں دیکھے وہ دنیا نے زمانے

تیری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اُسی اک پل کے افسانے ، زمانے

تیری سانسوں کی سوغاتیں، بہاریں
تیری نظروں کے نذرانے ، زمانے

کبھی تو میری دنیا سے بھی گزرو
لئے آنکھوں میں ان جانے زمانے

انہی کی زندگی جو چل پڑے ہیں
تری موجوں سے ٹکرانے ، زمانے

میں فکرِ رازِ ہستی کا پرستار
مری تسبیح کے دانے ، زمانے

اس اپنی کرن کو آتی ہوئی صبحوں کے حوالے کرنا ہے
کانٹوں سے الجھ کر جینا ہے، پھولوں سے لپٹ کر مرنا ہے
شاید وہ زمانے لوٹ آئیں، شاید وہ پلٹ کر دیکھ بھی لیں
اُن اجڑی اجڑی نظروں میں پھر کوئی فسانہ بھرنا ہے
یہ سوزِ دروں، یہ اشکِ رواں، یہ کاوشِ ہستی، کیا کہیئے
مرتے ہیں کہ کچھ دن جی لیں ہم، جیتے ہیں کہ آخر مرنا ہے
اک شہرِ وفا کے بند دریچے آنکھیں میچے سوچتے ہیں
کب قافلہ ہائے خندۂ گل کو اِن راہوں سے گزرنا ہے
اس نیلی دھند میں کتنے بجھتے زمانے راکھ بکھیر گئے
اک پل کی پلک پر دنیا ہے، کیا جانا ہے، کیا مرنا ہے
رستوں پہ اندھیرے پھیل گئے، اک منزلِ غم تک شام ہوئی
اے ہم سفرو! کیا فیصلہ ہے اب چلنا ہے کہ ٹھہرنا ہے
ہر حال میں اک شوریدگیٔ افسونِ تمنا باقی ہے
خوابوں کے بھنور میں بہہ کر بھی خوابوں کے گھاٹ اترنا ہے

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں، گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے اُبھر کر!
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول

کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے۔
عروسِ گل بہ قبائے جہاں، گلاب کے پھول

جہانِ گریۂ شبنم سے کس غرور کے ساتھ!!
گزر رہے ہیں تبسم کناں، گلاب کے پھول

یہ میرا دامنِ صد چاک، یہ ردائے بہار
یہاں شراب کے چھینٹے، وہاں گلاب کے پھول

کسی کا پھول سا چہرہ، اور اس پہ رنگ افروز
گندھے ہوئے بہ خمِ گیسواں، گلاب کے پھول

خیالِ یار، ترے سلسلے، نشوں کی رُتیں
جمالِ یار، تری جھلکیاں، گلاب کے پھول

مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ!
لہو کی لہر، دلوں کا دھواں، گلاب کے پھول

سلگتے جاتے ہیں، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں، گلاب کے پھول

یہ کیا طلسم ہے، یہ کس کی یاسمیں باہیں!
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں، گلاب کے پھول

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں، گلاب کے پھول

دل نے ایک ایک دکھ سہا، تنہا
انجمن انجمن رہا، تنہا!

ڈھلتے سالوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا ہے بارہا، تنہا

تیری آہٹ قدم قدم اور میں
اس معیت میں بھی رہا تنہا

کہنہ یادوں کے برف زار دل سے
ایک آنسو بہا، بہا تنہا

ڈوبتے ساحلوں کے موڑ پہ دل
اک کھنڈر سا رہا سہا، تنہا

گونجتا رہ گیا خلاؤں میں
وقت کا ایک قہقہہ، تنہا

ایک شبیہ

کچھ دنوں سے قریب دل ہے، وہ دن
جب اچانک اسی جگہ، اک شکل
میری آنکھوں میں مسکراتی ہے

ایک پل کے لئے تو ایک وہ شکل
جانے کیا کچھ تھی۔ جھوٹ بھی، سچ بھی
شاید اک بھول، شاید اک پہچان

کچھ دنوں سے تو جان بوجھ کے اب
یہ سمجھنے لگا ہوں، میں ہی تو ہوں
جس کی خاطر یہ عکس ابھرا تھا
کچھ دنوں سے تو اب میں دانستہ
اس گماں کا فریب کھاتا ہوں

روز اک شکل، اس دوراہے پر،
اب مرا انتظار کرتی ہے
ایک دیوار سے لگی، ہر صبح،
ٹکٹکی باندھے، نیم رُخ بیٹھو،
اب مرا انتظار کرتی ہے
میں گزرتا ہوں، مجھ کو دیکھتی ہے
میں نہیں دیکھتا وہ دیکھتی ہے
اس کے چہرے کی ساخت، ساعتِ دید
زرد ہونٹوں کی پیتریاں، پیتل
سرخ آنکھوں کی ٹکڑیاں، قرمز

روغنی دھوپ میں دھنسے ہوئے پاؤں
منتظر منتظر، اُداس اُداس

کبھی پل بھر کو ایک یہ چہرہ ——
جانے کیا کچھ تھا، لیکن اب تو مجھے
اپنی وہ بھول بھولتی ہی نہیں!

ایک دن یہ شبیہہ دیکھی تھی
کچھ دنوں سے قریب دل ہے وہ دن
کچھ دنوں سے تو بیتتے ہوئے دن
اسی اک دن میں ڈھلتے جاتے ہیں
دن گزرتے ہیں، اب تو یوں جیسے
عمر اسی دن کا ایک حصہ ہے!
عمر گزری، یہ دن نہیں گزرا
جس طرف جاؤں! جس طرف دیکھوں
مجھ سے اوجھل بھی، میرے سامنے بھی
شکل اک ٹین کے ورق پہ دبی!
شکل اک دل کے پھوٹے ٹیں وہی

میونخ

آج کرسمس ہے
شہرِ میونخ میں آج کرسمس ہے

رودِ بادِ عسار کے پُل پر
جس جگہ برف کی سلوں کی سڑک
فان کاچے کی سمت مڑتی ہے
قافلے قہقہوں کے اُترے ہیں
آج اس قریۂ شراب کے لوگ
جن کے رُخ پر ہزیمتوں کا عرق
جن کے دل میں جراحتوں کی خراش
ایک عزمِ نشاطِ جُو کے ساتھ
اُمڈ آتے ہیں مست راہوں پر
باہیں باہوں میں ہونٹ ہونٹوں پر

برف گرتی ہے ساز بجتے ہیں!
کوتے میریں کے اک گھروندے میں

ایک بوڑھی، اُداس، ماں کے لئے
پھول اِک طاقچے پہ ہنستے ہیں
گرم انگیٹھی کے عکسِ لرزاں سے
آگ اِک آئنے میں جلتی ہے!
زرد کمرے کے گوشے گوشے میں
جورِ ماضی کا سایۂ مصلوب
آخری سانس لینے لگتا ہے!
ماں کے چہرے کی ہر عمیق شکن
ایک حیران مسکراہٹ کے !
دلنشیں زاویوں میں ڈھلتی ہے
'میری شالاط' اے میری شالاط
لے میں قربان، تم آگئیں بیٹی!
اور وہ دخترِ ارضِ المان، جب
سر سے گٹھڑی اُتار کر جھک کر
اپنی امی کے پاؤں پڑتی ہے،
اس کی پلکوں پہ ملک ملک کی گرد
ایک آنسو میں ڈوب جاتی ہے

ایک مفتوح قوم کی بیٹی!
پارۂ ناں کے واسطے تنہا
روتے عالم کی خاک چھان آئی

دس برس کے طویل عرصے کے بعد
آج وہ اپنے ساتھ کیا لائی !
روح میں، دیس دیس کے موسم
بزمِ دوراں سے کیا ملا اس کو
سیپ کی چوڑیاں، ملایا سے
کینچلی چاپان کے اک اژدر کی
ٹھیکری اک مہنجو دارو کی
ایک نازک بیاض پر، مرا نام
کون سمجھے گا، اس پہیلی کو ؟

فاصلوں کی کمند سے آزاد،
میرا دل ہے کہ شہرِ سیر نخ ہے
چار سُو، جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں

جلوسِ جہاں

میں پیدل تھا، میرے قریب آ کے اس نے بہ پاسِ ادب اپنے تانگے کو روکا،
اچانک جو بجری کی پٹڑی پہ سُم کھڑکھڑائے، سڑک پر سے پہیوں کی آہٹ پھسل
کر جو ٹھہری

تو میں نے سنا ایک خاکستری نرم لہجے میں، مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا
چلیں گے کہاں آپ؟ —— بازار، منڈی، سٹیشن، کچہری،
پلٹ کر جو دیکھا تو تانگے پہ کوئی سواری نہیں تھی، فقط اک فرشتہ
پھٹے کپڑے پہنے، عنانِ دو عالم کو تھامے ہوئے تھا،
میں پیدل تھا، اتنے میں کڑکا کوئی تازیانہ، بہا فرشِ آہن پہ ٹاپوں کا سرپٹ تڑاڑا،
کوئی تند لہجے میں گرجا "ہٹو سامنے سے ہٹو" اور پُرشور پہیے
گھنا گھن مری سمت جھپٹے، بمشکل سنبھل کر جو دیکھا کھچا کھچ بھرے
تیز تانگے کی مسند پہ، اک صورتِ سگ لگامِ فرس پہ جھکی تھی،

یہ لطفِ کریمانہ، خوش دل بھی ہے، پر غیظ خوئے سگاں بھی،
مرے ساتھ رو میں ہیں لوگوں کے جتنے رویے، یہ سب کچھ، یہ سارے قضیے
غرض منڈیاں ہی غرض منڈیاں ہیں،
یہی کچھ ہے، اس رہگذر پہ متاعِ سواراں،
میں پیدل ہوں، مجھ کو جلوسِ جہاں سے انہی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے۔

پچاسویں پت جھڑ

اتنا بھرپور سماں تھا، مگراب کے تو ہراک گرتے ہوئے پتے کے ساتھ
اور اک مٹی کی تہ —— میرے لہو میں تیری،
اور اک ریت کی سلوٹ —— میرے دل میں اُبھری،
اور اک زنگ کی پپڑی —— مری سانسوں پہ جمی،
اتنا بھرپور سماں تھا مگراب کے تو مجھے جس نے بھی دیکھا یہ کہا:
'جانے کیا بات ہوئی، کچھ تو بتا'
تیرے ہونٹوں سے تو اب ایک وہ مرجھائی ہوئی موجِ تبسم بھی گئی ——"
میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے پیکر میں
اک تپش ایسی بھی ہے، جس کے سبب،
روح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے،
ٹوٹتی کڑیوں میں، جینے کے جتن جڑتے ہیں
میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے جسم کے ریشوں کے اس الجھاؤ میں ہے
ایک وہ گرتی سنبھلتی ہوئی، نازک سی، دھڑکتی ہوئی لہر

جو ہر اک دکھ کی دوا ڈھالتی ہے،
جو گزرتے ہوئے لمحوں کے قدم روکتی ہے،
مجھ سے کہتی ہے کہ "دیکھو ایک برس اور بُجھا
دیکھو اب کے ترے بتیسی پہ دھبّہ سا پڑا، دانت گرا
گھاؤ یہ اب نہ بھریگا، یہی بہتر ہے کہ ہونٹوں پہ لگا لے کسی چھوٹی سی کڑی
سوچ کی مہر"
اب کے تو ایک مجھی کو یہ خبر ہے کہ میں کیوں مہر بہ لب پھرتا ہوں
ورنہ سب لوگ یہی کہتے ہیں، اس شخص کو دیکھو، اب تو
اس کے ہونٹوں سے وہ مرجھائی ہوئی موجِ تبسّم بھی گئی،

ریزۂ جاں

ہماری زندگیوں کے سمندروں میں چھپے
کہیں دلوں کی تہوں میں، عجیب اندیشے!
کبھی کبھی، انہی لہروں کی گونج میں، ہم نے
اک آنے والے تموّج کی سیٹیاں بھی سنیں،

مگر کسی کو خبر کیا ہے اک وہ ربطِ عمیق
وہ گھور اندھیروں کا ترکہ ہمارے ذہنوں میں
وہ اک لبس بھری حِس — جو ہوا میں بہتے ہوئے
سیاہ لمحوں کی آہٹ کو بھانپ لیتی ہے!

کسے خبر ہے کہ اس جان و تن کی گتھی میں،
لہو کی پگھلی سلاخوں کے اس جھمیلے میں
کڑی وہ کون سی ہے، اُلجھے سلسلوں کی کڑی،
کہ جس کی دل میں یہ مدھم سی اک جھنک، پھر آج
مرے لئے کوئی مبہم سی بات لائی ہے!

میں ڈر گیا ہوں ـــ پُراسرار واسطوں کے نظام
یہ خوف بجا تو ہے اِک وہ حصارِ بے دیوار،
جو میرے دل کو تری بستیوں نے بخشا ہے،
تری ہی دین، یہ سانحوں کو سونگھتی حِس
ترا ہی خوف، اس ان بوجھے رابطے کا ثمر

میں ایک ریزۂ جاں ان عجیب قرنوں میں
ترے ہی خوف کی زد میں، تری گرفت میں ہوں
ترے ہی ربط کی حد میں ـــ تری پناہ میں ہوں

ایک فلم کو دیکھ کر

دھیرے دھیرے، ایک نڈھال سی لے میں ساز بجے'
اس کے انگ انگ نے اک انگڑائی لی'
اُبھری رقص کی رو
تڑپی گھائل سی اک لَے
لچکی اُس کے بدن کی ڈھال
اِک اِک تیز نرت کے ساتھ
اِک اِک بندھن اُترا،
پلو ڈھلک ڈھلک کر
رُکے، گرے!

سامنے اک،
جگ مگ جسم،
گِرتی، مُڑتی، ٹوٹ ٹوٹ کے جُڑتی، مرمر کی ڈھلوان!
سب کچھ قاشیں، خلیے، ماس، مسام
سب کچھ ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو
سب کچھ، جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دُنیا
گول سڈول کرّے ــ انمول زمینیں ــ ساحل ــ جھرنے ــ دُھوپ ــ

چاندنی — مخمل — پھول —
سب کچھ، رقص کے روپ میں ڈھلتا، ٹک ٹک چلتا، اک متحرک عکس!
سب کچھ پاس بلاتے، پیاس بڑھاتے، ارمانوں کا سراب،
آج اک دوست نے پاس بلاکر، چائے پلاکر
پہلے تو کچھ دیر ادب اور شعر کی باتیں کیں،
مجھ سے مری اک نظم سنی
اور پھر اس کے بعد یہ فلم، کہ جس کے سارے قرینے تھے،
مجھ پر طنز مری اس بوسیدہ سی نظم پہ طنز،
دونوں اتنے لبادوں میں!
باہر نکلا تو سنسان سڑک تھی، شب خزاں تھی
ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں ناچ رہی تھیں

ایکٹرس کا کنٹریکٹ

مرا وجود مری زندگی کا بھید ہے دیکھ!
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز،
یہ ایک رُوح بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر!

ذرا قریب تو آ — دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب جن کی اک جھلک کے لئے
کبھی قبیلوں کے دل جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے تو یہی ہونٹ سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں!
قریب آ یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے!
جو تو کہے تو یہی نرم لہریا آنچل،
یہی نقاب مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ردا، مری انگڑائیوں سے مسکی ہوئی
یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے!
بس ایک شرط — یہ گوہر سطور دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
اکائیوں کے ادھر جتنے دائرے ہوں گے
ادھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے

ڈھلتے اندھیروں میں.....

ڈھلتے اندھیروں میں کچی مٹی پر، کولتار کی سڑکوں پر، ہر جانب
وہی پرانی — کھدی ہوئی سی — لکیریں پہیوں کی اور وہی پرانی
گرد — عناد — اور جمگھٹ

وہی پرانی روندی ہوئی سی صبحیں —
لیکن کہاں سے آتی ہیں یہ دل کے مساموں میں بھر جانے والی مہکاریں
اَن دیکھے پھولوں کی
کانوں کے پردے بجتے نظر آتے ہیں — نغمے بجتے سب شور اور دل کے پردے
بجتے نظر آتے ہیں —
ازلیں بھی ایسی ہی خوشبوؤں میں جاگی ہوں گی!

شام کی سڑکیں، وہی پرانے چہرے
سارے دن کی تھکی ہوئی یہ عبودیت، اور بے مہر نگاہوں کے آوازے ہر سو،
سب لوگ اپنے دلوں کی دھرتی پر بے امن، سب ان راہوں پر بے منزل
یونہی، جانے کب سے.......

اور بستی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کتنے سکون سے نہر میں پانی
دھیرے دھیرے چمکتا چمکتا رواں ہے .... اب جب رات کا سارا کالا بوجھ
ان گھنے گھنے پیڑوں پر آن جھکا ہے
دیواروں کے گھیرے میں اب یہ کیسی نیندیں سلگ اٹھی ہیں جن کے
عنبری دھوئیں میں موت اور زیست کی سرحدیں مل جاتی ہیں!

ایک زمانہ ختم ہوا ہے ــــــ اک دن گزرا ہے!

سب کچھ ریت

سب کچھ ریت، سرکتی ریت
ریت کہ جس کی ابھی ابھی قائم اور ابھی ابھی مسمار تہیں تقدیروں کے
پلٹاوے ہیں
جل تھل، اتھل پتھل سب جیسے ریت کی سطحوں پر کچھ مٹتی سلوٹیں
کیسی ہے یہ مجبوری اور بے بسی اور بکھر بکھری ریت
جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرّے میں پہاڑوں کا دل ہے
ابھی ابھی ان ذرّوں میں اک دھڑکن تڑپی تھی؛
ابھی ابھی اک سلطنت ڈوبی ہے؛
ابھی ابھی ریتوں کی سلوٹوں کا اک کنگرا ٹوٹا ہے؛
سب کچھ ریت، سرکتی ریت ......

سانحات

کوئی بھی واقعہ کبھی تنہا نہیں ہوا
ہر سانحہ اک اُلجھی ہوئی واردات ہے

آندھی چلے تو گرتی ہوئی پتیوں کے ساتھ
لاکھوں صداقتوں کے ہیں ڈانڈے ملے ہوئے
دیکھے کوئی تو دیکھتی آنکھوں کے سامنے
کیا کچھ نہیں کہ دیکھنا جس کا محال ہے

اک جام اُٹھا کے میں نے زمیں پہ پٹخ دیا!
سوچو، اس ایک لمحے میں کیا کچھ نہیں ہوا
ہر سمت ڈھیر صد صدف سانحات کے
تو بس کنارِ قلزمِ دوراں پہ لگ گئے
پرکھو تو رنگ رنگ کی سیپیوں پہ ہے
لہروں کے تازیانوں کی تحریر الگ الگ!

چاہو تو واقعات کے ان خرمنوں سے تم
اک ریزہ چن کے فکر کے دریا میں پھینک دو
پانی پہ اک تڑپتی شکن دیکھ کر ہنسو !
چاہو تو واقعات کی آندھیوں میں بھی ــــ
تم یوں کھڑے رہو کہ تمہیں علم تک نہ ہو
طوفان میں گھر گئے ہو کہ طوفاں کا جزو ہو

چہرۂ مسعود

مالک، تیری اِس دنیا میں، آج ہماری زندگیوں کو کیسے کیسے دُکھوں
کا مان ملا ہے!

ایسے دُکھ جو ٹیسیں بھی ہیں، دھیر بھی ہیں اور ڈھارس بھی ہیں
مالک، آج اس دیس میں اس بستی میں، کوئی اگر دیکھے تو ہر سو
بھری بہاروں، فصلوں، کھلیانوں پر پھیلی دُھوپ کی تہ کے تلے، اِک
خون کے چھینٹوں والی چھینٹ کی میلی اور مٹیالی چادر بچھی ہوئی ہے
موت کی میلی اور مٹیالی موج میں، رنگ لہو کے، نقش لہو کے!
ایک ایک چمکتی سطح کے نیچے، راکھ لہو کی، ساکھ لہو کی۔

کوئی اگر دیکھے تو آج اس دیس میں۔ بانس کی باڑ میں، دھان کے کھیت میں
ڈھنڈی ریت میں

جگہ جگہ پر بکھری ہوئی نورانی قبریں
آنگن آنگن روشن قدریں
مائیں ـــــ جن کے لال مقدس مٹی
بہنیں ـــــ جن کے ویر منوّر یادیں
بالک ـــــ جن کی مایا، بے سدھ آنسو
مرنے والے کیسے لوگ تھے، ان کا سوگ بھی اِک سنجوگ ہے، اُن کا دُکھ
بھی ایک عبادت

کیسے لوگ تھے، موت کی لہر پہ، آگ کی پینگ میں جھولے، تجھ کو نہ بھولے،
ہم کو نہ بھولے!

روحوں کی دیوار میں ایک ہی چہرہ، قبروں کی الواح میں ایک ہی چہرہ

مالکؑ ہمیں بھی اُس چہرے کے ماتھے کرب عطا کر
مالکؑ اس چہرے کا سچا سورج، سدا ہماری زندگیوں میں ڈوب کے اُبھرے!

اپنے یہ ارمان

اپنے یہ ارمان تو سب غرضیں ہیں، کھری بھی اور کھوٹی بھی،
ان سب غرضوں کی دھن میں اُس کی دھن ہے،
اور ہمارے خیالوں کے اندر تو بھونروں کی روحوں کے بھنور ہیں،
اُڑ اُڑ کر اپنی غرض کی سیدھ میں ہم آتے ہیں،
جو بھی رستہ کاٹے اس کو ہم ڈستے ہیں،
پھر جب من کی باتیں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں،
ذہن ہمارا دنیا کے بھیدوں کو پرکھنے لگ جاتا ہے
اک یہ پرکھ ہی تو ہے جو یوں نفرت سکھلاتی ہے
اپنی محرومی لاکھوں شاخوں والی اک تد ہے، جس کی
سب سے مقدس ٹہنی پر نفرت کا پھل لگتا ہے۔
میراجی تو پھر بھی چکا اس پھل سے،
کب تک دیکھوں میں، ٹیڑھی پلکوں سے، ان لوگوں کو،
میری دید سے جو غافل ہیں،
کیوں نہ بہا دوں، اک تنکے کی طرح، اس دنیا کو، اس ندی میں، جو
تیری رُوح کی بانہوں میں بہتی ہے،

منوا، آج تو تو نے یہ کیا سوچا
سب اچھے ہیں یہ، تیری میٹھی سوچیں، مورکھ منوا!

اے رے من......

اے رے من، تیرے بھی تو ہیں کیسے دکھاوے،
آج تو میں نے بالکل واضح دیکھا..... اس کا چہرہ......
جیسے وہ زندہ ہو!
دھوپ میں چلتے چلتے، میں نے دیکھا...... اس کا چہرہ
چہرہ..... جیسے ہوا کی تہوں کا چھلکا......
میں جس دھوپ میں تھا وہ دھوپ تھی اس کے گرد اک چھتری
جس کی چمک میں
چینہ چینہ چمک سے وہ چہرہ ویسا ہی چیترک تھا،
جیسا دنیا میں تھا
اور وہ دلنے اب بھی چمکتے چمکتے ببلے لگتے تھے،
جانے اب وہ کس دنیا میں، کچی اینٹوں کی چھتری والے کون سے گھر میں
کن اندھیاروں میں ہو،
وہ..... جس کی بابت سوچوں تو سینے میں اک بجلی تپ جاتی ہے،
وہ..... جو مٹی میں اب ..... مٹی کا چھلکا ہے،
مٹی..... جس پر بارش کے دانوں کے دھبے ہیں۔
شاید تیرا ہی یہ پاگل پن تھا، کون اب اس کو دیکھ سکے گا،
اے رے من، تیرے بھی تو ہیں کیسے دکھاوے
تجھ پر ہنسنے کو جی چاہا
ورنہ یوں کوئی یاد آ جائے تو آنسو کس سے رُک سکتے ہیں۔

لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر......

لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر اب مدتوں کے بعد ایک یہ دن آیا ہے
دن جو ایسے دنوں کی یاد دلاتا ہے جو سدا ہمارے ساتھ ہیں

اس کہرے میں، اس جاڑے میں
اُڑتے ہوئے ان ریزہ ریزہ بادلوں میں وہ سب نزدیکیاں ہیں
میرے وجود کا طلسم رہی ہیں
ورنہ کتنے دور ہیں دکھ جو صدیوں کا حصہ ہیں
کتنی دور ہے موت جو ان سب نسبتوں پر چھائی ہے ان سب ہستیوں کا حصہ ہے!

اس لمحے تو دکھ اور موت کی ان نزدیکیوں میں بھی زیادہ قریب ہے
وہ غافل کر دینے والی بے حس زندگی
اور وہ زندہ رکھنے والی جابر غفلت
جو اس میرے وجود کا طلسم ہے

اس ٹھنڈک میں یہ اک دھیمی دھیمی سی مانوس تمازت
ساری بھولیں، سارے خیال اسی کی کونپلیں

میرے گھر میں آم کے پیڑ کے نیچے تو خندق ہے' اب کے کھاد اس کو کیسے ڈالیں گے .
کب آئیں گے آنے والے دن اور بُور اور کونپلیں !
کبھی نہ آنے والی رُتوں کے دھیان کہ جن پر آج تو نظریں جم جاتی ہیں
اور میں سوچتا بھی نہیں کیا کوئی کل بھی آئے گا
ساری ندامتیں بھول گیا ہوں !
اور وہ سب نزدیکیاں' جن کو میں نے اتنی دور سے دیکھا ہے
آج تو وہ سب میرے سامنے ہیں' اس جاڑے میں مدت کے بعد آنے والے اس کہرے میں .

زینیا[1]

(۱)

انگاروں کا روپ
جیٹھ ہاڑ کی دھوپ
اور اس جلتے سمے
مہکیں تیرے سنگ
رنگ رنگ کے رنگ

(۲)

پاتے موجِ نمو
خوشبو تج کر تو
اگنی پیتے پھول
تیری جبیں پر لاکھ
بجھے دلوں کی راکھ

(۳)

روپ ہو کتنا انوپ
باس بنا کیا روپ
اس پھلواڑی میں
خوشیوں کی اک لہر
زندگیوں کا شہر

(۴)

جیناان کا
امر بہاروں کا
سونپ کے دل کی باگ
دکھ کی دھوپ جلیں
اس کی بھینٹ نہ دیں

(۵)

دیکھ سکے تو دیکھ
جیون کے یہ لیکھ

لے کر اس جگ میں
سونے کا کشکول!
سب اک پل کے مول
اپنے من کی سگندھ
بیچنے آتے ہیں
کیا تو اور کیا میں

ص۸ زینیا ایک پھول جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ یہ موسم گرما میں کھلتا ہے مگر اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔

صدا بھی، مرگِ صدا

نہ کوئی سقفِ منقش، نہ کوئی چترِ حریر
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس ایک تودۂ خاک!

بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجومِ کرمکِ کور
بس ایک قبۂ گور!

نہ کوئی لوحِ مسطر، نہ کوئی خشتِ نشاں،
یہیں پہ دفن ہے وہ صاحبِ سخن کہ جسے
نظامِ دنیا نے!

ہزار مرتبہ عرضِ نوا کی دعوت دی
مگر وہ اپنی فصیلِ خیال میں محصور
رہ زمانہ سے دور

خروشِ برق سرِ نیستاں سے بے پروا
سکوتِ سینۂ یک چوبِ نے میں ڈوب گیا
صدا بھی، مرگِ صدا!

یہیں یہ گلتی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر میں اب
دبے پڑے ہیں وہ لمحے، جو رزقِ سم نہ بنے
زلفِ غم نہ بنے!
یہیں یہ، ریزۂ سل بن کے جم گئے ہیں وہ ہات
جو اشکبار زمانوں کی موجِ رقصاں سے
شرارِ چن نہ سکے!

کرید کر، کوئی اس راکھ کو اگر دیکھے،
تو آج ایک رگِ سنگ ہے وہ نبضِ تپاں
وہ جوئے خونِ رواں

وہ زندگی کے تلاطم میں ڈوبتی ہوئی آگ
سریرِ خامہ کی تقدیس بیچتا ہوا فن
تمام گردِ کفن!

یہ کرم خوردہ اساطیر کا بلند الوند،
یہ سب درست مگر پھر بھی اک سوال ہے آج
جواب کا محتاج!

کوئی بتائے کہ اس وقت کیا کرے انساں
جب آسماں کی آنکھوں سے روشنی چھینیں
ستم کی سنگینیں!

یہیں وہ دفن ہے ـــــ وہ روح جس کی دہکتی آگ
جو ڈھل سکی بھی کبھی تو ڈھلی بہ قالب حرف،
پہن سکے جامۂ برف!

ضمیرِ ارض پہ کھنچی گئی لہو کی لکیر۔
اور اس کا ایک بھی چھینٹا نہیں سرِ قرطاس
بہ مصحفِ احساس!

ستم کی تیغ چلی، گردنوں کی فصل کٹی،
اور اس تمام فسانے کی اک بھی سطرِ حزیں
زبورِ غم میں نہیں!

پکارتی رہیں پیہم کراہتی صدیاں،
اور ایک گونج بھی ان کی نہیں صدا انداز
بہ گنبدِ الفاظ!

پہاڑ لرزے ستاروں کی بستیاں ڈوبیں
اُٹھ سکی نہ مگر رُخ سے پردۂ افسوں
ردایتِ مضموں!

یہیں یہ دفن ہے وہ جسم، وہ ردایتِ خاک
وہ دل کہ جس کے دھڑکتے ہوئے بیانِ الم
کو چھو سکا نہ قلم!

یہی سوال، اب اس قبر کے اندھیروں میں
ہزار رینگتے کیڑوں کی سرسراہٹ ہے
اجل کی آہٹ ہے

یہ قبر طنز ہے ان لازوال ارادوں پر
نگل گئے جنہیں ظلمت کے خشمگیں عفریت
مقدّروں پہ محیط!

مقدّروں کے دھوئیں سے اُبھرتے رہ گیر،
نشان اس کا مٹاتے چلو زدِ پا سے
جبینِ دنیا سے!

دل پتھر کا ـــــــ

اس پتھر پر اک پل کی گھائل آنچ بھی گھاؤ
اس پنکھڑی کو بہا نہ سکا طوفانوں کا بھی بہاؤ
دل پتھر کا۔
پتھر پنکھڑی پھول کی

دل کیا جانے کہاں ہے وہ بے انت سمے کا پڑاؤ
جہاں پہ جل کر راکھ ہوئے ہیں زندگیوں کے الاؤ
دل جو سُنے تو جگرتے ہوئے سناٹوں کی یہ کراہ
اک سندیس ہے
"جینے والو ہم کو یاد نہ آؤ"

دل کو یاد کریں وہ سمے دل بھول چکا وہ سبھاؤ
رات کی میلی کروٹ، آخری سانسوں کا ٹھہراؤ
کسی امر ارمان کی ہچکی، کسی صدا کے شبد
کہیں سے ڈھونڈو ان شبدوں کو لے بے مہر ہواؤ
کبھی کھِلے پتھر پنکھڑی پھول کی'

اے ری چڑیا......

جانے اس روزن میں بیٹھے
تو ہیان میں تیری، چڑیا، اے ری چڑیا

بیٹھے بیٹھے تو نے کتنی لاج سے دیکھا،
پیتل کے اس اک تل کو جو تیری ناک میں ہے،
اپنی پت پریوں مت ریجھ، خبر ہے، باہر
اک اک ڈائین آنکھ کی پتلی تیری تاک میں ہے،
تجھ کو یوں چمکانے والوں میں ہے،
اک جگ تیرا بیری، چڑیا، اے ری چڑیا

بھولی تو یوں اڑتی، پنکھ جھپکتی،
یہاں کہاں آ ٹھہرتی، چڑیا، اے ری چڑیا

یہ تو مرے دل کا پنجرہ ہے، تو اس میں
اپنی ٹوٹی پھوٹی خوشیاں ڈھونڈنے آئی ہے؟
پگلی، یہاں تو ہے ہیرے کی کنی کا چوگا
اور اک زخمی سانس اس پنجرے کی انگنائی ہے!
اڑ اور لہکی ہوتی بن بیلڑیوں میں
جا، چن اپنے رے ری چڑیا، اے ری چڑیا

ایک صبح ..... سٹیڈیم ہوٹل میں

یوں تو اس چوکور تپائی کی اس سادہ سی بیٹھک میں کیا رکھا ہے،
لکڑی کی اک عام سی شے ہے، پڑی ہے، .....
یوں تو اس پر رکھے ہوئے گلدان میں کیا رکھا ہے، .....
پیلے پیلے سے کچھ تازہ پھول ضرور ہیں اس میں ......
پھول تو گلدانوں میں ہوتے ہی ہیں،
اور پھر اس چوکور تپائی پہ گرنے والا، ہوا کا ترچھا جھرنا،
جس میں دھوپ کی نازک سی ہلکی سونے کا رنگ بکھیر گئی ہے
خیر، یہ دھوپ کی رنگت بھی تو جگہ جگہ ہے

لیکن یہ سب چیزیں اور یہ چاروں خالی کرسیاں اور یہ سب کچھ،
مل کر، ایک عجیب آسودہ سی ترتیب ہے، ساکت ساکت،
مرا ذہن کچھ اتنا الجھا ہوا ہے، مجھ کو چیزوں کی ترتیب اچھی لگتی ہے
جانے ...... کون یہاں آ کر بیٹھے گا ......
سب کچھ اک آنے والے اچھے سمے کا اَن ہونا پن ہے

مریض کی دُعا

کل تک تو یہ دنیا میرے لئے اک آئینہ تھی،
جس میں میری نخوت آنے والے کل کا یقینی چہرہ دیکھ کے اتراتی تھی،

تُو تو سب کچھ جاننے والا ہے، میں کتنا خودغرض تھا،
اب تک جب بھی تجھ کو یاد کیا ہے،
اپنی نخوت کی اس بھول میں تم کو یاد کیا ہے،

لیکن آج مجھے اس بات کا ڈر ہے،
کل جب آنے والا کل آئے گا
میرے بے حس سرد مساموں کو روشنیاں، — اک
ڈھیلے ٹاٹ کے جھول میں میرے جسم پہ شاید جیتے
دنوں کی آخری کرنیں ہوں گی

آج مرا یہ عہد ہے تجھ سے،
کل کو — آنے والے کل کے بعد — اگر کچھ دن بھی میرے لئے ہیں،
تو مرا اک اک دن اُس دن کی اطاعت میں گزرے گا،
تیرے خزانوں میں جو میرے سمیت سبھی کے لئے ہے اور
کسی کے لئے بھی نہیں ہے،

تیرے عیب میں تو سب کچھ حاضر ہے
کل کے بعد بھی مرے ارادوں کو توفیق کے دن دے؛
اے وہ جس کے آج میں فرداؤں کے ابد ہیں۔

یہ سب دن

یہ سب دن
تنہا، نا یکسو
یہ سب اُلجھائوے
کالی خوشیاں کالے غم
اے رے دل!
رہا ہے تو اب تک
کن بھگتانوں میں!
اور اب بھی تو آگے سب
ایک وہی گزران، دنوں کی جس کی رو
جذبوں اور خیالوں میں ٹکراتی ہے
ہم جیتے ہیں، ان روحوں کو بھلانے میں
سدا جو ہم کو یاد کریں
سدا جو ہم کو اپنے مشبک غرفوں سے دیکھیں
جیسے پورب کی دیوار پہ انگوروں کی بیلوں میں
بڑھتے، رُکتے ننھے ننھے، چمکیلے نقطے
کرنوں کے ریزے
جمع ہر صبح کو

ہر جھونکے کے ساتھ
ان پتّوں کی درزوں میں
لاکھوں دل
تیری خاطر جلتے بجھتے ہیں
کس کی خاطر؟ —— آج کا یہ اک دن
کیسا دن؟
یہاں تو ہے بس ایک وہی اندھیر دنوں کا جس کی رو
روحوں میں اور جسموں میں چکراتی ہے

مینا

جب تو ان کے گھر کے صحن میں اک میناتھی، چاندی کے پنجرے میں
تجھ کو وہ دن اچھے لگتے تھے، نا
تب تو تجھ کو اس کی خبر بھی نہیں تھی .... تیرے آب و دانے میں
کیا ہے!

تجھ کو خبر بھی نہیں تھی ......
تب تیرا چوگا تو انگوروں کے رس میں گندھا ہوا نمکیلا بھیجا تھا
اُن جلتی آنکھوں والی بے تن کھوپڑیوں کا —
جن کے مہین خلیوں میں اک وہ چنگاری جلتی تھی جو سر لگا ہے
تجھ کو وہ دن اچھے لگتے تھے، نا
اور اب بھی تم کو وہ یاد آتے ہیں نا — اب بھی
اب جب تلواروں کی نوکیں تیرے گلے پر رکھ کر تجھ کو پیار بھری
نفرت سے یوں چمکارتے والے،

اپنے جسموں کی مٹی میں خواب فنا ہیں
میری باتیں سن کر، مجھ کو ٹک ٹک دیکھنے والی،
چور کور آنکھوں والی، مینا
ہاں وہ قاتل اچھے تھے، نا
اب تجھ کو وہ دن یاد آتے ہیں، نا
اب اس وادی کی بھرپور گھنی سبز فضا میں اُڑنا اور یوں راتب چننا
کتنا مشکل ہے!

اب تو اُڑنے میں تیرے پر دکھتے ہیں نا،

مرے دیس ....

مرے دیس کی اِن زمینوں کے بیٹے
جہاں صرف بے برگ پتھر ہیں، صدیوں سے تنہا
جہاں صرف بے مہر موسم ہیں اور ایک دردوں کا سیلاب ہے، عمر پیما

پہاڑوں کے بیٹے
چنبیلی کی نکھری ہوئی پنکھڑیاں، سنگِ خارا کے ریزے
سجل دودھیا، نرم جسم ۔۔۔ اور کڑے، کھردرے، سانولے دل
شعاعوں، ہواؤں، زمانوں کے زخمی
چٹانوں سے گِر کر، خود اپنے ہی قدموں کی مٹی میں اپنا وطن ڈھونڈتے ہیں

وطن ۔۔۔ گرم پانی کے تسلے میں ڈھیر ان منجھے برتنوں کا
جسے زندگی کے پسینوں میں ڈوبی ہوئی محنتیں دربدر ڈھونڈتی ہیں

وطن ــــ وہ مسافر اندھیرا
جو اونچے پہاڑوں سے گرتی ہوئی ندیوں کے کناروں پہ شاداب شہروں میں رک کر
کسی آہنی چھت سے اٹھتا دھواں بن گیا ہے

ندی بھی زر افشاں
دھواں بھی زر افشاں
مگر پانیوں اور پسینوں کے انمول دھارے میں جس درد کی موج ہے عمر پیما
ضمیروں کے قاتل اگر اس کو پرکھیں
تو سینوں میں کالی چٹانیں پگھل جائیں۔

جانے اصلی صورت کیا ہو......

جانے اصلی صورت کیا ہو، ذہن کی اُس اک رو کی،
جس کے ساتھ بہا کی میری سوچ اور میری عمر اور میری دُنیا،
بہتے بہتے یوں تو جب بھی دیکھا ہے، میرا دل اک وہ قوّت تھی،
جس کے آگے پہاڑ بھی تنکا تھے، یہ سب کچھ تو تھا،
لیکن سدا ہی میں سمجھا، سدا رہا میں اِس پشیمانی میں،
اک یہ دراڑ جو میرے بھیجے دماغ میں کون اس کو پھلانگ سکے گا،
اک یہ دراڑ، کہ جس کے ادھر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں سارے خیال اور
سارے ارادے
جس کے ادھر میں ذلّت ہے،
جس کے ادھر میں اک بے بس قوّت ہوں
اک یہ دراڑ کہ جس کے ورے وہ مقدس آگ ہے جس کی لو میں کلیوں کی
بو رکھا ہے،
اک یہ دراڑ جو میرے بھیجے دماغ میں ہے کب۔ اس کو پاٹ سکوں گا،
اپنی حدوں کی حد سے آگے کب یہ قدم اٹھے گا،
آگے، جہاں وہ سرشاری ہے جس کی کشید بھی ا... میرے ہی ذہن میں
ہوتی ہے

دروازے کے پھول

بنت کی دھوپ اُن پھولوں کا دفتر تھی، جس میں روز ان کی اِک مسکراہٹ کی
حاضری لگتی،
شام کے سائے، اُن کی نیندوں کے آنگن تھے،

صبح کو ہم اپنے اپنے کاموں پر جاتے، تو اس سبز سڑک کے موڑ پہ
تازہ دم پھولوں کے رنگ برنگے تختے ہم سے کہتے!
"کرنوں کا یہ دھن، سب کا ہے، سب کا
جیو جیو سب مل کر سنگت سے بے رنگت!"

پھر جب دن کی روشنیاں تھکتیں تو اُس موڑ پہ، نیندیں اوڑھ کے سہمے ہوتے
وہ پھول، یہ ہم سے کہتے
"سب کا بیری ہے یہ اندھیرا
جلد اپنے اپنے اینٹوں سے چنے ہوئے سپنوں میں پہنچو
اچھا، کل کو ملیں گے، کل کو کھلیں گے!"

لیکن اب وہ تختے اجڑ گئے اور اب اُس کوٹھی کے دروازے پر
چکنی بجری ہے، اور تھرکتے چمکیلے پہیے ہیں۔

صاحب تم نے تو اتنا بھی نہ دیکھا
یہ سب پھول تو خوشیاں تھیں، محنت کش خوشیاں
اور یہ لاکھوں کا حصّہ تھیں
تم نے تو اتنا بھی نہ سوچا
اے ہم لوگوں کی راحتِ حق کی خاطر لڑنے والے وکیلِ جلیل!

میرے سفر میں ......

میرے سفر میں، اِک اِک دن کا سورج، اک اک دیس تھا،
ان دیسوں کے اک اک باسی کے دل سے گزرا ہوں،
میں نے دیکھا ان کے دلوں کے آنگن سونے سونے تھے،
ان کی مگن آنکھوں میں ڈورے سونے کے تھے،
اک اک صبح کو اُن کی سواری کے لئے آتی تھی سورج کی رتھ، سونے کی

لیکن آج یہ جس پر میری نظر رکی ہے کون ہے یہ مٹی کا پتلا، ان سڑکوں پر،
جس کو دیکھ کے میرے جی میں بھر گئے ہیں وہ "آنسو"
آنسو، جن کے سبب سے سونے کے وہ سب زنگار جو میرے عقیدوں پر
تھے، اتر گئے ہیں

اور اب یہاں کھڑا ہے، میرے سامنے ننگے پاؤں وہ مٹی کا پتلا کیچڑ میں،
کرنوں کے کیچڑ میں
اک وہ، جس سے اس کے دیس کے سارے سورج ہم نے چھین لئے ہیں

اور میری نظروں کے سامنے اپنے کرموں کے کیچڑ میں، لتھڑی ہوئی
نظر آتی ہیں

ساری مدّتیں جواب تک ان دنوں کے دیسوں میں آئی ہیں
میرے سینے کے اندر اک چھوٹا سا کوٹھا گر پڑتا ہے اور
اک چھوٹے سے خیال کی دنیا ان میری آنکھوں میں اُمڈ آتی ہے

اور میرا دل مجھ سے پوچھتا ہے، جانے ہم اپنی روحوں میں کب اس سورج کو
اُبھرا ہوا دیکھیں گے،
وہ سورج، جو اب تک کبھی نہیں ڈوبا۔

اپنے باہر

اور وہ بھی اک ایسی محویت تھی جس میں سدا صدہا آنکھوں نے اٹھائے
اپنے نازک پردوں پر بوجھ اس موسیقی کے، جو روحوں میں لہرا جاتی ہے!

اور پھر اک وہ محویت بھی دین تھی کیسی کیسی آسودہ شاموں کی:
ان گلیوں میں کیسے کیسے لوگ تھے، جو یوں اپنے دلوں کے گمانوں میں
جیتے تھے،
اک لمحے میں ابد کو دیکھنے کا احساس عجب اک مستی تھی، وہ جس
کے گمانوں میں جیتے تھے!
ان کو اس کی خبر نہیں تھی، یہ گہری محویت
موجِ ابد سے کٹ کر گرا ہوا وہ ساکت لمحہ ہے، جس کے ٹھہراؤ میں
رک جاتے ہیں،
وہ سب ذکر کہ جن کو جاری ہی رہنا ہے،

باہر دیکھو..... اس دوارِ حقیقت کی جو گم میں جو بھی پڑا، اس کی آنکھوں
میں تو بھر بھر گیا بوجھ اس ذکر کا،
جو مٹی میں مل کے مٹی نہیں ہوتا
سنبھلو..... سوچو..... تم کس محویت میں ہو، لوگو،
اپنے ذہن سے خود کو جھٹک کر اپنے باہر دیکھو،

میں کس جگ میں تھا......

میں کس جگ میں تھا اب تک.....
کہاں تھا اب تک یہ خیال کہ جس کی روشنی میں آج اپنی بابت سوچا ہے، تو
خود کو اک ظلمت کی منزل میں پایا ہے.....
جو بھی اچھائی ہے، مجھ تک آتے آتے میرا عیب ہے،
رستے جہاں پر سب آکر ملتے ہیں، منزل ظلمت کی ہے میں جس میں ہوں
میں...... جو اپنی بے سروسامانی میں تیرے ذکر کا اہل نہیں ہوں،.....
اندیشوں سے بھرا ہوا یہ سر تو کھڑکھڑاتی ہوئی مٹی کا اک ٹھیکرا ہے، جو
تیرے قدموں پر جھک جائے، تو بھی
تیری جلالت کا رتبہ نہیں بڑھتا، جو پہلے ہی اوجِ مراتب پر ہے،
وہ سب رستے تیرے علم میں ہیں، جو
میرے دل کی ظلمت پر آکر ملتے ہیں،
اور جو تیری صداقت کے سرچشموں سے پھوٹے تھے،
صد ہا سمتوں سے آنے والے ان رستوں کے پیچھے
روشنیوں کے ابد ہیں
...... جن کی اوٹ میں آگے ظلمت کی منزل ہے، میں جس میں ہوں....
باقی سب دنیا اب بھی اُس جگ مگ میں ہے، جس سے ابھی ابھی میں
باہر آیا ہوں،

بستے رہیں سب......

بستے رہے سب تیرے بھرے، کوفے
اور نیزے پر، بازاروں بازاروں گزرا
سر...... سرور کا!

قید میں منزلوں منزلوں روتی
بیٹی ماہِ عرب کی
اور ان شاموں کے نخلستانوں میں گھر گھر روشن رہے الاؤ!

چھینٹے پہنچے، تیری رضا کے ریاضوں تک خونِ شہدا کے
اور تیری دنیا دمشقوں میں بے داغ پھریں زرکار عبائیں!

سامنے لہو بھرے طشتوں میں، تھے مقتول گلابوں کے چہرے
فرشوں پر
اور ظلموں کے درباروں میں آہن پوش ضمیروں کے دیدے سب بے نم تھے!

مالک تو ہی اپنے ان سب شقی جہانوں کے غوغا میں
ہمیں عطا کر
زیرِ لب ترتیلیں، اُن ناموں کی، جن پہ تیرے لبوں کی مہریں ہیں.

دن کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بُو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گزرا اِدھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا! یہ آ گئے ہم کس دیار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

ہے کنجِ عافیت، مجھے پاکر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگذار میں

گہرے سروں میں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سِل رکھ کے بات کر

یہ دوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

تیرا دیار، رات، مری بانسری کی لے
اس خوابِ دل نشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
ان الجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر

آ ایک دن، مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جو سے بات کر

امجد نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم ایک سات کر

جو ہو سکے تو مرے دل، اب اِک وہ قصّہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی
کبھی سفر ہی سفر میں، جو عمرِ رفتہ کی سمت
پلٹ کے دیکھا تو اڑتی تھی گردِ فردا بھی
مرے وجود میں ہیں جلتے موسم، ان کو بھی
رُتوں کے رس میں بھیگے سایو، تم نے دیکھا بھی
بڑے سلیقے سے، دنیا نے مرے دل کو دیئے
وہ گھاؤ جن میں تھا سچائیوں کا چہرا بھی
کسی کی روح سے تھا ربط، اور اپنے حصے تھی
وہ بے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصّہ بھی
یہ آنکھیں، منبتی وفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی
یہ رسم، حاصلِ دنیا ہے۔ اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سبھی نفرتوں کا ایما بھی
دلوں کی آنچ سے تھا برف کی سِلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینہ بھی
مجھے ڈھکی چھپی، ان بوجھی الجھنوں سے ملا
جچی تُلی ہوئی اک سانس کا بھروسہ بھی
کبھی کبھی انہی الھڑ ہواؤں میں مجید
سنا ہے دور کے اک دیس کا سندیسہ کبھی

کبھی تو سوچ! ترے سامنے نہیں گزرے
وہ سب سمے، جو ترے دھیان سے نہیں گزرے

یہ اور بات کہ ہوں ان کے درمیاں میں بھی
یہ واقعے کسی تقریب سے نہیں گزرے

ان آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکس عدم
دوامِ درد! ترے رت جگے نہیں گزرے

سپردگی میں بھی اک رمزِ خود نگہ داری
وہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گزرے

بکھرتی لہروں کے ساتھ ان دنوں کے تنکے بھی تھے
جو دل میں بہتے بہتے رُک گئے، ہمیں گزرے

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر، انجمؔ
جو اپنی روح کی منجدھار سے نہیں گزرے

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بتا
کتنی عمر اور گھٹنے نہ سے، پھر بھی وہی صحرا
چیت آیا، پیسیتا ڈنی بیتی، اپنا وچن نبھ
پت جھڑ آئی، پتّر ٹکے، آ جیون بیت چلا
خوشیوں کا مکھ چوم کے دیکھا، دنیا مان بھری
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا
اپنا پیکر، اپنا سایہ، کاٹے کو کس کٹھن
دوری کی جب سنگت ٹوٹی، کوئی قریب نہ تھا
اپنے گرداب اپنے آپ میں گھلتی کرچ بھی
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا
کانچ کی آپ دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم
دل سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا
راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں اک اک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا
دکھ لیے کتنے لاکھوں مکھڑے کس کس کی سنیے
بولی تو اک اک کی دیسی، بانی سب کی جدا

اپنے دل کی چٹان سے پوچھو ریزہ اک پنکھڑی کا کتنا بوجھل ہے
اک آنسو کی بوند میں دیکھو، دنیا دنیا، عالم عالم، جل تھل ہے

جس کو دیکھو اپنے سفر کی دنیا بھی ہے، اپنے سفر میں تنہا بھی ہے
قدم قدم پر اپنے آپ کے سامنے ہے اور اپنے آپ سے اوجھل ہے

روح سے روح کا نازک بندھن، پھولوں کی زنجیر میں جکڑی زندگیاں
کتنے دکھ ہیں، کتنا چین ہے، کیسی دھوپ ہے، کتنا گہرا بادل ہے

آنکھ کی پتلی، سانس کی ڈوری، دل کی تھاپ، اک پل کی نرت کا تماشا ہے
گھٹتی کھڑکیوں سے چنی دیواروں پر اک جلتی جوت کی جھل جھل ہے

ایک زمانے سے یہی رستہ زیرِ قدم ہے، اک اک جھونکا نرم ہے
آج جو من کی اوٹ سے دیکھا، ہر سو اک ان دیکھی رت کی ہلچل ہے

جتنی روشنیاں ہیں کارِ شعاعیں، بکھری ٹھیکریاں، بے حرف سطریں!
اک دن انت یہی ہے، مگر وہ ایک کرن جو دل کے ورق پہ جدول ہے

عزمِ نظر نہیں، ہوسِ جستجو نہیں
کوئی بھی اب شریکِ غمِ آرزو نہیں

ہے اس چمن میں نالۂ صد عندلیب بھی
صرف ایک شورِ قافلۂ رنگ و بو نہیں

تیرے نصیبِ شوق میں لکھا تھا یہ مقام
ہر سُو ترے خیال کی دُنیا ہے تو نہیں

ہنستا ہوں پی کے ساغرِ زہرابِ زندگی
میں کیا کروں کہ مجھ کو تڑپنے کی خو نہیں

عمروں کے اس معمورے میں ہے کوئی ایسا دن بھی جو
روح میں ابھرے، چاند کے سورج کے سیال سمندر کو!

اتنے کام ہیں، ان سو آج صفوں میں خوش خوش پھرتا ہوں
لیکن آج اگر کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا — تو

ایک سفر ہے صرف مسافت ایک سفر ہے جزوِ سفر!
جینے والے یوں بھی جیتے ہیں، اک عمر اور زمانے۔ دو

یہ ان جانا شہر پرائے لوگ، اے دل، تم یہاں کہاں
آج اس بھیڑ میں اتنے دنوں کے بعد ملے ہو، کیسے ہو

دنیا جڑی تڑی سچائی، سب سچے، کوئی تو کبھی!
اس اندھیر سے نکلے اپنے جھوٹے روپ کے درشن کو

آخر اپنے ساتھ کبھی تو اک بے مہر مروت بھی —
اپنے سارے نام بھلا کر، کبھی خود اپنے گن تو گنو

کچی نیند اور جسم نے دھوپ چکھی اور دل میں پھول کھلے
گھاس کی سیج پہ میں ہوں تمہارے دھیان میں آ نیرالے تو!

اک سانس کی مدھم لَو تو یہی، اِک پل تو یہی، اک چھن تو یہی
تج دو کہ برت لو دل تو یہی، چین لو کہ گنوا دو دن تو یہی

لرزاں ہے لہو کی خلیجوں میں، پیچاں ہے بدن کی نسیجوں میں
اک بجھتے ہوئے شعلے کا سفر، کچھ دن ہے اگر کچھ دن تو یہی

میں ذہن پہ اپنے گہری شکن، میں صدق میں اپنے بھٹکا ہوا
ان بند حصوں میں اک انگڑائی   منزل ہے جو کوئی کٹھن تو یہی

اس دُھند سے جیتیں سینوں کے شرر، جھونکوں میں کُھلیں قدروں میں تُلیں
کاوش ہے کوئی مشکل تو یہی، کوشش ہے کوئی ممکن تو یہی

پھر برف گری، اک گزری ہوئی پت جھڑ کی بہاریں یاد آئیں
اس رُت کی بجھنت ہواؤں میں ہیں کچھ ٹیسیں اتنی دُکھن تو یہی،

سفر کی موج میں تھے، وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ جو ابھی اس قریۂ بہار میں تھے

وہ ایک چہرے پہ بکھرے تھکے تھکے سے خیال
میں سوچتا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے

وہ ہونٹ جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا مرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے کل
میں اس طرف سے جو گزرا وہ انتظار میں تھے

میں کچھ سمجھ نہ سکا میری زندگی کے خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیرے تھے کس شمار میں تھے

میں دیکھتا تھا وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے ابھی گردِ روزگار میں تھے

میں دیکھتا تھا، اچانک یہ آسماں پہ گرے
بس ایک پل کو رُکے اور پھر مدار میں تھے

ہزار بھیس میں ستیارسوں کے سفیر
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

جو دل نے کہدی ہے وہ بات ان کہی بھی نہ تھی
یہ موج تو تہِ دریا کبھی رہی بھی نہ تھی !
جھکیں جو سوچتی پلکیں، تو میری دنیا نے
ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی
سنی جو بات کوئی ان سنی تو یاد آیا
وہ دل کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی
نگر نگر رہی آنکھیں، پسِ زماں، پسِ در
مری خطا کی سزا، عمر بھر رہی بھی نہ تھی
کسی کی روح تک اک فاصلہ خیال کا تھا
کبھی کبھی تو یہ دوری رہی کبھی بھی نہ تھی
نشے کی رو میں یہ چھلکا ہے کیوں نشے کا شعور
اس آگ میں تو کوئی آبِ آگہی بھی نہ تھی
غموں کی راکھ سے امجد، وہ شمس طلوع ہوئے
جنہیں نصیب اِک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

جاوداں قدروں کی کشتی اور اُلجھی ۔ جل اٹھی تقدیرِ دل
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرّے میں بھی ہے تصویرِ دل

اپنے دل کی راکھ چن کر، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اِک سیال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل

میں نہ سمجھا، ورنہ ہنگاموں بھری دنیا میں اک آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا، آج جس کا قہقہہ دل میں ہے دامن گیرِ دل

رت بدلتے ہی چمن جو ہم صفیر اب کے بھی، کوسوں دور سے
آ کے جب اس شاخ پہ چہکے، مرے دل میں بجی زنجیرِ دل

کیا سفر تھا۔ بے صدا صدیوں کے پار، اس ہمہاتے موڑ تک
پے بہ پے ابھرا، سنہری گرد سے اک نالۂ دلگیرِ دل

وار دنیا نے کئے مجھ پر، تو، امجد میں نے اس گھمسان میں
اپنا سینہ چیر کر، رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

بنے جو زہر ہی وجہِ شفا جو تو چاہے
خریدلوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے

یہ زرد پنکھڑیاں جن پر کہ حرف حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے

تجھے تو علم ہے، کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا تو کیا، جو تو چاہے

جب ایک سانس گھسے، ساتھ ایک نوٹ پسے
نظامِ زر کی حسیں آسیا، جو تو چاہے

بس اک تیری ہی شکم سیر روح ہے آزاد
اب لے اسیرِ کمندِ ہوا، جو تو چاہے

ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ، جو تو چاہے

سلام اُن پہ تہِ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں، امجد
کھلیں وہ پھول بھی، اک مرتبہ جو تو چاہے

میری مانند، خود نگر تنہا — یہ صراحی میں پھول نرگس کا

اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی — اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دوری تھی — کوئی منزل تھی کوئی عالم تھا

ہائے وہ زندگی فریبِ آنکھیں — تو نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا

صبح کی دھوپ ہے کہ رستوں پر — منجمد تجلیوں کا اک دریا

گھنگھروں کی جھنک منک میں بسی — تیری آہٹ! میں کس خیال میں تھا

پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس — فاصلوں کی فصیل سے ابھرا

پھول مرجھا نہ جائیں بجروں میں — مانجھیو! کوئی گیت ساحل کا

وقت کی سرحدیں سمٹ جائیں — تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا

عمر جلتی ہے بخت جلووں کے! — زیست مٹی ہے بھاگ مٹی کا

رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس — پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا

جو خود ان کے دلوں میں تھا تہ سنگ — وہ خزانہ کسی کسی کو ملا

لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی! — یہ محیط، اک عجیب زاویہ تھا

ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی — بھول کر بھی اسے کبھی دیکھا

روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینا

یادوں کے دیس

کیسے جاؤں کیسے پہنچوں یادوں کے اُس دیس
جہاں کبھی اک آنگن کی دیوار پہ چپکے سے
دودھ کا ایک کٹورا رکھ جاتے تھے میرے لئے
غیبی ہاتھ جنہیں مٹی کی تہوں نے ڈھانپ لیا

جہاں کبھی اک قبّے دار مکان میں شام ڈھلے
نیلے پیلے شیشوں والے صندوقوں کے پاس
میرے لئے آٹے کے کھلونے توے پہ تلتے تھے
اچھے ہاتھ جو مٹی کے کنگن میں گئے بکھرا

شاید ان دو قبروں کے اب مٹ بھی چکے ہوں نشاں
لیکن اس پتھریلے بستر پر اب بھی ہیں میرے ساتھ
وہ دو محافظ روحیں جن کے چار مقدس ہاتھ
ڈھال گئے ہیں انگاروں میں انگ انگ مرا

اپنے دل کی کھوج میں کھو گئے کیا کیا لوگ
آنسو تپتی ریت میں بو گئے کیا کیا لوگ

کرنوں کے طوفان سے بجرے بھر بھر کر
روشنیاں اس گھاٹ پر ڈھو گئے کیا کیا لوگ

سانجھ سمے اس کنج میں زندگیوں کی اوٹ
بج گئی کیا کیا بانسری، رو گئے کیا کیا لوگ

میلی چادر تان کر اس چوکھٹ کے دوار
صدیوں کے کہرام میں سو گئے کیا کیا لوگ

گھٹڑی کالی رین کی، سونٹی سے لٹکائے
اپنی دھن میں دھیان نگر کو گئے کیا کیا لوگ

میٹھے میٹھے بول میں دوہے کا ہنڈول
سُن سُن اس کر بانوسے سو گئے کیا کیا لوگ

تارے

ہم تارے ہیں ہم تارے راج دلارے ہیں
ہم تارے چاند ستارے ہیں

خوش خصلت ہیں خوش طینت ہیں — ہم اس پرچم کی زینت ہیں
ہم جگ مگ کرتے تارے ہیں — ہم تارے چاند ستارے ہیں

ان پیلے سبز دیاروں میں — اس دنیا کے اندھیاروں میں
ہم روشنیوں کے سہارے ہیں — ہم تارے چاند ستارے ہیں

ہم پھول اور بس اور ہریالی — ہم علم اور امن اور خوشحالی
ہم پاک وطن کے دلارے ہیں — ہم تارے چاند ستارے ہیں

اس جیتے دیس میں جینا ہے — خوشیوں کا امرت پینا ہے
یہ باغ یہ پھول ہمارے ہیں — ہم تارے چاند ستارے ہیں

نوحہ

جو شمع بزم جہاں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

جو راحت دل وجاں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

جو روح عمر رواں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

ابھی ابھی تو یہاں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

یہ نظم مجید امجد نے اپنے والد محترم کی وفات کے
بعد کہی۔ (۱۶، اکتوبر ۱۹۶۸ء)

نوحہ

جو شمعِ بزمِ جہاں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

جو راحتِ دل وجاں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

جو روحِ عمرِ رواں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

ابھی ابھی تو یہاں تھے

کہاں گئے وہ لوگ

یہ نظم مجید امجد نے اپنے والدِ محترم کی وفات کے بعد کہی۔ (۱۶، اکتوبر ۶۸ء)

تاج سعید

سوچ سمندر	(شعری مجموعہ)	۲۰/-
نرم قلم	(شخصی خاکے، مضامین)	۱۲/-
خوشحال شناسی	(خوشحال خان خٹک کے کمالات کے بارے میں مضامین اور انکی شعری تخلیقات کے تراجم)	۱۶/-
مرے خدا مرے دل	(مجید امجد کی شاعری کا انتخاب) دوسرا ایڈیشن	۲۵/-

زیرِ طبع کتابیں

مجید امجد شخص و شاعر	(شخصیت و فن پر مضامین)
حرفِ شیریں	(ممتاز شیریں، شخصیت و فن کے آئینے میں)
دھڑکنیں	(علاقائی افسانے)
عکسِ گفتگو	(خاکے، انٹرویو)
طیفِ تمثیل	(ڈراما اور [illegible] بارے میں فنی، تاریخی اور تنقیدی مضامین)